فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۹۹

جنوری ۱۹۶۷ء تا جون ۱۹۶۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب ابو سلمان صاحب شاہجہانپوری	۲۹۵	۶	جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی دہلی یونیورسٹی	۳۴۹
۲	جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے، بی ٹی ایچ علیگ	۱۳۶ ، ۵۱	۷	جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی	۳۸۹
۳	جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی	۶۹	۸	نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم	۱۶۵-۸۵ ۲۴۵
۴	جناب ڈاکٹر اکمل ایوبی صاحب ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۴۳۴	۹	جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش	۲۸۲
۵	جناب ام مرتضیٰ صاحب نقوی ایم اے، پی ایچ ڈی ایل ایس سی انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز دہلی	۴۱۳	۱۰	جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب	۲۴۲ - ۲

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱۱	جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین	۷۸-۱۵۷، ۲۳۷-۳۰۶، ۳۱۱-۳۱۷، ۳۲۵-۳۹۵، ۴۷۷
۱۲	جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی	۴۰۵
۱۳	جناب حافظ غلام مصطفٰے صاحب ایم اے استاد شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۳۴۹-۴۳۷
۱۴	جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب لکچرار الہ آباد یونیورسٹی	۳۷
۱۵	جناب محمد آفاق صاحب صدیقی ایم اے علیگ	۴۶۴
۱۶	جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۲۰-۱۰۵
۱۷	جناب محمد شکیل احمد صاحب ایم اے شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی	۱۵۰
۱۸	جناب مولوی حکیم قاضی محمد عمران خاں صاحب بی اے سعیدیہ ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک	۲۲۳
۱۹	جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی	۱۱۹-۱۸۶، ۲۶۲-۳۶۹
۲۰	جناب محمود الحسن صاحب شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۲۰۷
۲۱	جناب مسعود حسین صاحب نظامی ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۳۸۰
۲۲	شاہ معین الدین احمد ندوی	۸۲-۱۶۲، ۲۳۷-۳۰۲، ۴۷۶
۲۳	جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۵

شعراء

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب اثیم خیرآبادی	۳۱۵
۲	جناب امتیاز احمد صاحب، دھولیاوی ایم اے، ایم جی کالج جلگاؤں	۳۹۳
۳	افسر، جناب خورشید افسر بسوانی	۴۷۴
۴	جناب انور موہانی	۴۷۳
۵	جناب تسکین قریشی	۲۲۵-۳۹۳
۶	جوہر، جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری	۲۳۶-۳۹۴
۷	جناب حبیب احمد صاحب، صدیقی ممبر پبلک سروس کمیشن	۴۷۲
۸	جناب طالب جے پوری	۲۳۶
۹	جناب عظیم حیدرآبادی بی اے بی ایڈ نلگنڈہ	۴۷۵
۱۰	جناب محمد حنیف خاں صاحب، اعظمی	۴۷۳

فہرست مضامینِ معارف

جلد ۹۹

جنوری ۱۹۶۷ء تا جون ۱۹۶۷ء

(بترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون	صفحہ
	شذرات	۲-۸۲-۱۶۲، ۲۴۲-۳۲۲، ۴۰۲
	مقالات	
۱	الفوز العظیم (سفرنامۂ حج)	۸۵-۱۶۵، ۲۴۵
۲	تاریخ سائنس کا ایک ادھورا باب	۴۰۵
۳	تصانیف حضرت شاہ نیاز بے نیاز بریلوی	۳۸۰
۴	تہذیب کی تشکیل جدید	۲۰-۱۰۵
۵	جاہلی شاعری میں زہدیہ رجحانات	۳۴۹-۴۳۷
۶	جمہوری دور کا ترکی ادب	۴۲۴
۷	سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کا شعری اور ادبی ذوق	۱۵۰
۸	سیاست میں اسلام	۴۶۴
۹	شام میں جدید عربی شاعری کا ارتقا	۵۱-۱۳۶
۱۰	شمالی ہند میں چند علمی و ادبی مراکز	۱۱۹-۱۸۶، ۲۶۲-۳۶۹
۱۱	ظہور الاسرار نامی اور مظہر کرہ	۵
۱۲	عماد الدین الاصفہانی مؤرخ و ادیب	۲۰۷
۱۳	فارسی لغات کی تدوین میں ہندوستان کا حصہ	۴۱۳
۱۴	قرون وسطیٰ میں عرب ہند کے سیاسی تعلقات	۳۷
۱۵	لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ	۶۹
۱۶	مشکل الآثار امام طحاوی	۳۲۵

شمار	مضمون	صفحہ	شمار	مضمون	صفحہ
۱۷	معین بن محمود کشمیری اور ان کی تصانیف	۲۲۳	۱۹	نوعی خبوشانی	۲۴۹
			۲۰	وحدت ادیان	۲۸۲
۱۸	مولانا ابو الکلام آزاد پر پہلی کتاب	۲۹۵			

تلخیص و تبصرہ

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
برطانیہ میں اسلام	۳۰۶	کمیونسٹ ملکوں کے مسلمان	۳۱۱

باب التقریظ والانتقاد

مضمون	صفحہ
معاشرتی و علمی تاریخ	۳۸۹

ادبیات

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
غزل	۲۳۵، ۲۳۶، ۳۹۳، ۳۹۴، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵-۴۸۲	جمال و کمال	۳۱۵

مطبوعات جدیدہ

۷۸، ۱۵۷، ۲۳۷، ۳۱۷، ۳۹۵، ۴۷۶

جلد ۹۹ ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۶۷ء عدد ۱

مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
شذرات	جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب	۲-۴

مقالات

مضمون	مصنف	صفحہ
ظہور الاسرار نامی اور مظہر گڑھ	جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۵-۱۹
تہذیب کی تشکیل جدید	جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۲۰-۳۶
قرون وسطیٰ میں عرب و ہند کے سیاسی تعلقات	جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب لکچرار الہ آباد یونیورسٹی	۳۷-۵۰
شام میں جدید عربی شاعری کا ارتقاء	جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے پی ایچ ڈی علیگ لکچرر شعبۂ عربی ونکٹیشور یونیورسٹی آندھرا	۵۱-۶۸
لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ	جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری ایڈیٹر البلاغ بمبئی	۶۹-۷۷
مطبوعات جدیدہ	ض	۷۸-۸۰

تصحیح: معارف دسمبر ۱۹۶۶ء کے صفحہ ۴۱۱ سطر ۱۸ کی عبارت اس طرح پڑھیے:

"بلکہ اس میں روح کی آمیزش کی گئی ہے جس سے مادہ کی وحشت دور ہو جاتی ہے"

اور صفحہ ۴۶۸ سطر ۱۲ میں فضل الرحمن صاحب گنوری کے ذکر میں ناگپور یونیورسٹی کے بجائے شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بنا دیجیے۔

(معارف)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

اب کئی سال پہلے حکومت ہند کی طرف سے ایک تعلیمی کمیشن مقرر ہوا تھا، اس کی رپورٹ کوٹھاری رپورٹ کے نام سے شائع ہوگئی ہے، اس کی تعریف بھی ہو رہی ہے اور اس پر تنقیدیں بھی جاری ہیں، جناب آصف فیضی صاحب سابق سفیر متحدہ عرب جمہوریہ کا ایک مراسلہ اسٹیٹسمین کلکتہ میں شائع ہوا ہے، جس میں انھوں نے یہ توجہ دلائی ہے کہ اس رپورٹ میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی، جاپانی، اسپینی اور چینی زبانوں کی تعلیم کے لیے تو سفارش کی گئی ہے لیکن ان زبانوں کے ساتھ جدید عربی کا نام نہیں ہے جو قابل افسوس ہے، جاپانی، اسپینی اور چینی زبانوں سے زیادہ حق جدید عربی کا ہے۔

جناب آصف فیضی نے جدید عربی کے حق میں بہت سے دلائل پیش کیے ہیں، یہ ریڈیو، پریس، پارلیمانی ایوانوں اور اہم تصانیف کی زبان ہے، یہ ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، یہ ادارہ اقوام متحدہ کی پندرہ ریاستوں کی زبان ہے، یہ ادارہ بین الاقوامی مسائل کو جن چھ زبانوں میں ترجمے کراتا ہے، ان میں ایک زبان جدید عربی بھی ہے، اس زبان کے ذریعہ معلومات عامہ، فلسفہ، مذاہب عالم، معاشرتی سائنس، لغات، سائنس، عربی ادب و تاریخ پر اہم کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں جن سے جدید علم و ادب میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے، پھر اسی زبان کے ذریعہ مشرق وسطی اور دوسرے عرب ممالک کی سیاسی، علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی روز افزوں ترقی کی رفتار سمجھی جا سکتی ہے، وغیرہ وغیرہ
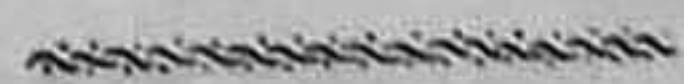
عربی زبان کی اہمیت ظاہر کرنے کیلیے جناب آصف فیضی صاحب کو دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی، اسکی بین الاقوامی اہمیت روز روشن کی طرح ظاہر ہے، لیکن معلوم نہیں کوٹھاری رپورٹ میں اسکو کیوں نظر انداز کر دیا گیا ہے، اس کمیشن میں ایسے رکن بھی تھے جو اس زبان کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھے، اسلیے یہ تاویل نہیں کیجا سکتی ہے کہ اس کا نام سہواً رہ گیا ہے، اور اگر واقعی یہ سہو ہے تو پھر جدید عربی کو بھی اور زبانوں کے ساتھ شریک کرکے اس فروگذاشت کی تلافی کا اعلان کیا جا سکتا ہے، متحدہ عرب جمہوریہ ہندوستان کا گہرا دوست ہے، اس اعلان سے دونوں ملکوں کے سیاسی اور ثقافتی تعلقات کی استواری میں بڑی مدد ملے گی، ورنہ وہاں کے سیاسی اور ثقافتی حلقوں میں بدگمانی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے، اور پھر ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کو یہ سوء ظن تو ضرور پیدا ہو جائیگا کہ یہ زبان اسلیے نظر انداز کر دی گئی ہو کہ یہ ان کی مذہبی زبان سمجھی جاتی ہے۔

اس کمیشن کو فارسی زبان بھی اپنی فہرست میں شامل کرنی چاہیے تھی، ہندوستان کا بہت بڑا دوست افغانستان بھی ہے جس کی علمی، ثقافتی اور سیاسی زبان فارسی ہی ہے، اس سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے میں فارسی زبان کی تعلیم مفید اور موثر ہوگی، ہندوستان اور ایران کے تعلقات بھی قدیم زمانہ سے قائم ہیں، ایرانی تہذیب تمدن کے آثار ہندوستانی زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آتے ہیں، اگر ہندوستان کے لیے فارسی اجنبی ہوگئی تو اس کے کلچر میں جو خوبیاں ہیں اور اسکا جو تاریخی اور تہذیبی پس منظر ہے وہ ہماری آیندہ نسلوں کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو جائے گا جو ہندوستان کے متحدہ کلچر کے حامیوں کے لیے ایک دردناک حادثہ ہوگا۔
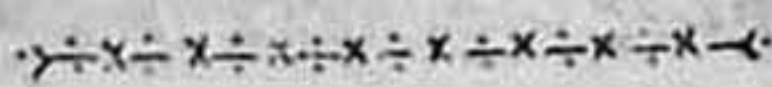
یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں میں فارسی زبان و ادب پر جو تحقیقی کام جاری ہے اور اس سلسلہ میں گذشتہ عہد میں ہندوستان کے اندر جو فارسی علم و ادب پیدا ہوا اس پر زیادہ توجہ دیجا رہی ہے، اور اب پی ایچ ڈی کے طلبہ کو زیادہ تر ایسے ہی موضوع دیے جاتے ہیں جن کا تعلق ہندوستان کے فارسی شعر و ادب سے

ہوتا ہے۔ اس علمی و ادبی جذبہ سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ لائق شعرا اور اساتذۂ ادب کا کلام منظر عام پر آتا جا رہا ہے، اور آئندہ آتا رہے گا۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی کی کوششوں سے سلاطین دہلی کے عہد کے بہت سے ایسے شعرا کا کلام دستیاب ہوگیا ہے جن کے متعلق خیال تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے نقش و نگار طاق نسیاں ہو چکے ہیں، اس کا ذکر دسمبر ۷۶ء کے معارف میں اور شبلی کانفرنس کی روداد میں آچکا ہے، اسی طرح ڈاکٹر امیر حسن صاحب عابدی ریڈر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی نے مثنویات غنی کشمیری کو اڈٹ کرکے ایک مفید ادبی کام انجام دیا ہے، یہ جموں اور کشمیر کلچرل اکیڈمی کی طرف سے شائع کی گئی ہے، ڈاکٹر امیر حسن عابدی نے ڈاکٹر تارا چند کے ساتھ مل کر پربودھ چندرودیا کے فارسی ترجمہ گلزار حال کو بھی اڈٹ کیا ہے جس کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے شائع کیا ہے، انھوں نے انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز نئی دہلی کے لیے وکرم اروشی کا فارسی ترجمہ بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر امیر حسن عابدی سے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی طرف سے ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے عہد کے فارسی شعر و ادب کی ایک مکمل تاریخ کی ترتیب دلانے کی فکر میں ہیں، اور اس پر کام شروع کر دیا گیا ہے، ڈاکٹر صاحب ہی سے معلوم ہوا کہ اب جب کہ فارسی علم و ادب میں ہندوستانیوں کے علمی و ادبی کارنامے سامنے آ رہے ہیں، تو سبک ہندی سے افغانستان کا تعصب تو ختم ہوگیا ہے، ایران والوں کا تعصب ابھی باقی ہے، لیکن وہ بھی اس کے خلاف اپنے تعصب کا برملا اظہار کرنے میں احتیاط کرنے لگے ہیں، ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کی کوئی اچھی چیز ان کے سامنے آجاتی ہے تو اس کو سبک ہندی کہنے کے بجائے سبک ایرانی کہہ کر اپنانے کی کوشش کرتے ہیں، اسی لیے ابوطالب کلیم اور نظیری کے فارسی دواوین کو شائع کرکے اپنی ادبی فراخدلی کا ثبوت دیا ہے، عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹیٹیوٹ پٹنہ کی طرف سے بھی فارسی کی کتابیں برابر شائع ہو رہی ہیں، اگر یہ انسٹیٹیوٹ بھی ہندوستان کے فارسی شاعروں اور ادیبوں کی معیاری کتابوں کی اشاعت کی طرف زیادہ توجہ دے تو اس کے ذریعہ سے بھی سبک ہندی کی مقبولیت مغربی ممالک میں ہو سکتی ہے، ورنہ ایرانی شاعروں اور مصنفوں کے دواوین اور تصانیف تو خود ایران میں آسانی سے چھپ کر شائع ہو سکتی ہیں، اب ضرورت سبک ہندی کو تسلیم کرانے کی ہے جس سے ہندوستان اور اس کے اہل علم دونوں کے وقار میں اضافہ ہوگا۔

مقالات

ظہور الاسرار نامی اور مطہر کڑہ

از جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"ظہور الاسرار" اور "مطہر کڑہ" کے عنوان سے محترم امتیاز علی عرشی صاحب کا ایک مضمون معارف اعظم گڈھ بابت ماہ جولائی و اگست ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا، نظامی گنجوی کی مثنوی "مخزن الاسرار" کی ایک شرح ظہور الاسرار کے نام سے مطبع نولکشور میں چند بار شائع ہوئی جس کے دیباچے[1] میں شارح کا نام ظہور الحسن بٹھوری بتایا گیا ہے، عرشی صاحب نے اس مضمون میں ثابت کیا ہے کہ یہ انتساب غلط ہے، در اصل یہ شرح بدر الدین مطہر بن قوام بن رستم بن احمد بن محمد البلخی المعروف بکربُی نے ۷۹۵ھ میں لکھی تھی، انھوں نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مطہر بلخی کربُی شارح "مخزن الاسرار" اور فیروز شاہ تغلق (۷۵۲ھ-۷۹۰ھ) کے عہد کا مشہور شاعر مطہر کڑہ ایک ہی شخص تھے، مجھے عرشی صاحب کے دوسرے قیاس سے اختلاف ہے، اس کی تفصیل بعد میں عرض کروں گا، فی الحال یہ عرض کرنا ہے کہ عرشی صاحب سے ۱۲ سال قبل حافظ محمود شیرانی مرحوم نے رسالہ "مخزن" لاہور بابت مارچ، اپریل ۱۹۲۹ء میں "فارسی زبان کی ایک قدیم فرہنگ میں اردو زبان کا عنصر" کے عنوان سے اسی موضوع پر گفتگو کی تھی، حافظ صاحب نے اس مضمون میں محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانۂ البلخی المعروف بکربُی کی فرہنگ "بحر الفضائل" پر بحث کی ہے، اور اس میں ہندوستانی کے کئی سو لفظوں کی فہرست

[1] عرشی صاحب کے پیش نظر طبع دوم کا نسخہ تھا جو ۱۳۰۲ھ میں چھپا تھا، حافظ محمود شیرانی کے مطالعے میں اشاعت دوم طبع نولکشور کا نسخہ تھا جس کی تاریخ ۱۸۸۵ء درج ہے۔

مرتب کی ہے۔ صاحب فرہنگ نے مختلف لغات کے ذیل میں یہ الفاظ بطور مترادفات کے لکھے ہیں، خود مؤلف نے آخری باب (چہلم) کا عنوان یہ قائم کیا ہے، "در الفاظ ہندوی کہ در نظم بکار آید۔ بحر الفضائل" کے ساتھ ساتھ اس مضمون میں مولف ہذا کی دوسری کتاب شرح "مخزن الاسرار" پر بھی گفتگو کی ہے۔

اور یہ بتایا ہے کہ شرح "مخزن الاسرار" کا مؤلف وہی ہے جس نے بحر الفضائل لکھی ہے، اور شرح پر بحث کرتے وقت یہ ثابت کیا ہے کہ نولکشور پریس میں یہ کتاب غلط نام سے شائع ہوئی[1]، ظہور الحسن ٹھوری اس کا مولف نہیں ہوسکتا، اس کے بعد انھوں نے یورپی مستشرقین اسپرنگر[2]، ایتھے[3]، اور ریو وغیرہ کی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جنھوں نے اس فرہنگ کو گیارہویں صدی ہجری کا بتایا ہے، اور یہ ثابت کرنے کی ناتمام کوشش کی ہے کہ محمد بن قوام یعنی شارح مخزن گیارہویں صدی کے اواخر کا مولف تھا،

عرشی صاحب نے بھی اپنے مضمون میں ان ہی دونوں باتوں کی وضاحت کی ہے۔ گویا مضمون کا زیادہ حصہ ان ہی مباحث سے متعلق ہے، جو شیرانی صاحب کا موضوع گفتگو تھا، اگر عرشی صاحب کے پیش نظر شیرانی صاحب کا مضمون ہوتا تو شاید ان کی گفتگو کا انداز بدل جاتا، بہرحال عرشی صاحب کے نتائج بعینہ وہی ہیں جو شیرانی صاحب کے ہیں، لیکن مضمون کے دوسرے حصے میں عرشی صاحب نے دوسرے موضوع پر گفتگو کی ہے۔ ان کے نزدیک شارح "مخزن الاسرار" عہد فیروز شاہی کا مشہور شاعر مطہر کڑہ ہے، شیرانی صاحب نے اس کے بجائے شارح "مخزن" کی ایک کتاب فرہنگ "بحر الفضائل" کا پتہ دیا ہے، اور مضمون میں پورا زور اسی فرہنگ کی تشریح و توضیح پر صرف ہوا ہے۔

---

[1] اس غلطی کا احساس مطبع والوں کو بھی تھا، مگر کوشش کے باوجود ان کو اس کی صحت کی کوئی صورت نہ مل سکی، کیونکہ دوسرا نسخہ انھیں نہیں مل سکا۔ (دیکھئے خاتمۃ الطبع کی عبارت) [2] فہرست کتابخانۂ اودھ ص ۱۲۱، ۵۷۰ میں [3] شرح گلستان سے تاریخ تصنیف یعنی ۱۰۹۱ھ نکالی ہے۔ یہی تاریخ انڈیا آفس مخطوطہ نمبر ۹۹۸ اور ۲۵۱۲ کے ذیل میں موجود ہے [4] فہرست مخطوطات فارسی ص ۵۰۳۔ ایوانوف نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست میں انھیں کی پیروی کی ہے۔

ایران میں بھی شارح "مخزن الاسرار" کی شخصیت کے بارے میں غلط فہمی واقع ہوئی ہے۔ "گنجینۂ گنجوی" ص "ق" میں آیا ہے:

"شرح مخزن الاسرار تالیف محمد بن قوام بن رستم بن رستم معروف ببکری در ۱۰۶۱ھ تالیف آں بانجام رسیدہ"۔

صاحب گنجینۂ گنجوی نے یہ تاریخ اسپرنگر اور دوسرے یورپی مستشرق سے لی ہے، اگر نقل میں غلطی ہوگئی یعنی تاریخ ۱۰۹۱ھ کے بجائے ۱۰۶۱ھ درج ہوگئی ہے، شارح کے شجرہ میں بھی تھوڑی سی غلطی باقی رہ گئی ہے، یعنی اس کے پردادا کا نام رستم کے بجائے احمد لکھا ہے، اس غلطی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، تعجب ہے کہ صاحب "گنجینہ" سے ایسی غلطی ہو، حالانکہ خود وحید دستگردی کے پیش نظر شرح کا ایک نسخہ موجود تھا، جیسا کہ انھوں نے "مخزن الاسرار" کے خاتمے پر ذکر کیا ہے۔

"دو نسخۂ خطی قدیمی را بدست افتادہ، یکی را محمود نام بلخی در حدود سنہ ہشتصد و دیگری را قاضی ابراہیم تبتی (کذا)، در سند بنام یوسف محمد خاں تالیف و در حقیقت ہمان شرح محمود بلخی را زیر و رو کردہ الخ"

اگرچہ وحید دستگردی نے اس جگہ شرح کی تاریخ ۸۰۰ھ ہجری لکھی ہے (گیارہویں ہجری نہیں) لیکن جب خود شرح میں ۷۹۵ھ درج ہے تو پھر ٹھیک تاریخ درج نہ کرنا بے احتیاطی کی دلیل ہے، دوسرے شارح کا نام محمد کے بجائے محمود اور قاضی ابراہیم کو جو دوسرے شارح ہیں، تتوی کے بجائے تبتی لکھنا بڑی بے خبری ہے، اس سے بھی بڑی غلطی وہ ہے جو گنجینۂ گنجوی میں ملتی ہے، یعنی تاریخ تالیف ۷۹۵ھ کے بجائے ۱۰۶۱ھ قرار دیا ہے۔

لیکن خود ایران میں ابن یوسف شیرازی نے فہرست کتابخانۂ مجلس شوریٰ ملی میں اس کتاب خانے کے دو قلمی نسخوں کی مدد سے مؤلف اور سال تالیف کے بارے میں بالکل

صحیح اطلاع بہم پہنچائی ہے[1]، یہ ضرور ہے کہ ان کے پیش نظر نولکشور پریس کا مطبوعہ نسخہ نہ تھا جس میں اس کا انتساب دوسرے مولف کی طرف کر دیا گیا ہے، اس بنا پر ان کو غلط فہمی میں پڑنے کا موقع نہ تھا، مگر یورپی مستشرقین کے غلط بیانات یقیناً ان کے سامنے تھے، مگر انھوں نے ان سے صرف نظر کر کے مولف کا نام محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانہ بلخی معروف بکرئی اور سالِ تالیف ۱۰۹۵ھ درج کیا ہے، جو بالکل صحیح ہے،

ادھر حال ہی میں لاہور کی پبلک لائبریری میں جو فارسی مخطوطات ہیں، انکی ایک توضیحی فہرست شائع ہوئی ہے، اس میں "بحر الفضائل" کا ایک نسخہ ہے، مگر اس کی وضاحت کے سلسلے میں وہی سب غلطیاں دہرائی گئی ہیں، جو اسپرنگر، ایتھے وغیرہ کے یہاں پائی جاتی ہیں، اس کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ مولف گیارھویں صدی ہجری کے اواخر کا آدمی ہے،

ان ابتدائی امور کے ذکر کرنے کے بعد اب ہم جناب عرشی صاحب کے مضمون کے دوسرے حصے کی طرف رجوع کرتے ہیں، جس میں انھوں نے شارح "مخزن الاسرار" اور مظہر کڑہ کو ایک شخص ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے دلائل یہ ہیں:۔

۱۔ دونوں کا زمانہ اور وطن ایک ہے،

۲۔ کم از کم شرح "مخزن الاسرار" کے ایک نسخے[2] میں شارح کا نام مظہر بن قوام ملتا ہے:

۳۔ دیوان مظہر میں جن شعراء کا ذکر ہے، اُن میں سے اکثر شرح "مخزن الاسرار" میں مذکور ہیں،

۴۔ شارح مخزن مذکور "نصاب العقلاء" کا مولف ہے، اسی طرح کی ایک کتاب نصیب اخوان ہے، جو مظہر کی بتائی گئی ہے، دونوں کے ایک ہونے کے امکان ہیں،

۵۔ مظہر کڑہ نے حضرت نظام الدین اولیاء کے بعد کسی بزرگ "رکن حقیقت" کا ذکر کیا ہے،

[1] ج ۳ ص ۵۰۶ - ۵۰۸ [2] مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے بقول اس شرح کا جو نسخہ مدرسہ رفیع الاسلام پشاور کے کتابخانہ میں تھا، اس میں اس کا نام مخزن الاسلام اور مصنف کا نام مظہر بن قوام بن رستم الخ ہے،

شارح نے شرح میں رکن الدین ابو الفتح کا نام لیا ہے، یہ دونوں ایک ہی شخص معلوم ہوتے ہیں،

۶۔ دونوں شاعر اور عالم تھے۔

قبل اس کے عرشی صاحب کے دلائل کے سلسلے میں کچھ عرض کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں شخصیتوں کے الگ الگ ہونے کے جو اہم قرائن ہیں پہلے انھیں پیش کر دیا جائے،

(۱) محمد بن قوام یعنی شارح "مخزن الاسرار" کی ایک اور تالیف "بحر الفضائل فی منافع الافاضل" ہے، اس کتاب کے حسب ذیل نسخوں کا علم ہو سکا ہے،

۱۔ کتابخانۂ آصفیہ، دو نسخے، ایک مختصر[1] (نمبر ۸۴) دوسرا ناقص الاول (نمبر ۲۵۱)

۲۔ انڈیا آفس لائبریری، تین نسخے[2]، ایک کامل، دو ناقص،

۳۔ لاہور پبلک لائبریری[3]، ایک نسخہ، ناقص،

۴۔ دانشگاہ تہران، ۳ نسخے، ایک کتابخانہ مرکزی (نمبر ۳۲۶۹)، دوسرا مذکورۂ نشریہ کتابخانہ تہران ۲: ۲۰۰ اور تیسرا مذکورۂ نشریہ کتابخانہ ۳: ۶

۵۔ ملک پروفیسر شیرانی ایک نسخہ، کامل اور قدیم۔

ان نسخوں میں جو تفصیلات ملتی ہیں، ان سے پوری طرح ثابت ہوتا ہے کہ یہ فرہنگ اور شارح "مخزن الاسرار" ایک ہی شخص یعنی محمد بن قوام بن رستم کی تراوشِ خامہ کا نتیجہ ہیں، حافظ محمود شیرانی نے خود فرہنگ مذکور سے اس کی تاریخ تالیف تلاش کی ہے۔ فرہنگ کے چوتھے باب میں مختلف فرقوں کے مروجہ سنین و تاریخ کے ضمن میں یہ عبارت مرقوم[4] ہے:

"آغاز تاریخ ہجری از غرۂ ماہ محرم گرفتند و در این وقت از تاریخ ہجرت بنا بر ہشتصد سی و ہفت سال"

[1] فہرست میں عنوان بحر الافاضل درج ہے (ج ۲ ص ۱۴۵) [2] فہرست مخطوطات فارسی مخطوطہ نمبر ۹۹
[3] دیکھئے فہرست مخطوطات فارسیہ لاہور ۱۹۶۳ء ص ۲۵۱ [4] رسالہ مخزن، مارچ ۱۹۲۹ء

اسی طرح بکرماجیت کے سال سمبت کے بیان میں مذکور ہے[1]:-

"و تاریخ ایشان از جلوس راے بکرماجیت است در اجین و در ایں وقت از تاریخ او یکہزار و چار صد و نود سال است"۔

ان دونوں بیانوں میں اس فرہنگ کی تاریخ ہجری کے اعتبار سے ۸۳۷ھ اور سمبت کے اعتبار سے ۱۴۹۰ء ہے، ۸۳۷ھ ہجری ۱۴۳۳ء عیسوی کے مطابق ہے، ۱۴۹۰ء سمبت کی بھی اسی عیسوی سال سے تطبیق ہوتی ہے۔ آجکل ۲۰۲۳ء سمبت ہے، ۱۴۹۰ء میں فرہنگ مذکور تالیف ہوئی، گویا آج ۵۳۳ھ سال قبل، ۱۹۶۶ء میں ۵۳۳ کی تفریق سے سال عیسوی یعنی ۱۴۳۳ء برآمد ہوتا ہے۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ یہ کتاب ۵۳۳ھ سال (شمسی)، ۵۴۹ سال (قمری) قبل تصنیف ہوئی۔

اس کتاب کی تاریخ تالیف دو اور جگہ بیان ہوئی اور دونوں جگہ غلط ہے، ڈاکٹر شہریار نقوی نے اپنی کتاب "فرہنگ نویسی" میں لکھا ہے[2] "ولی چنانکہ در شرح مخزن الاسرار تالیف دیگر توام اشارہ شدہ فرہنگ مزبور در سال ۷۹۵ھ نوشتہ شدہ است"۔ شرح مخزن میں فرہنگ کا ذکر مطلق نہیں، بلکہ خود اس شرح میں مذکور ہے کہ ۷۹۵ھ میں شارح اس کی تالیف میں مشغول ہے، نشریۂ دانشگاہ تہران[3] میں بھی اس فرہنگ کی تاریخ تالیف ۷۹۵ھ بتائی گئی ہے اور فہرست کتابخانۂ مرکزی دانشگاہ تہران کا حوالہ دیا گیا ہے، حالانکہ فہرست مزبور میں ۷۹۵ھ شرح مخزن فہرست کی تاریخ قرار دی گئی نہ فرہنگ بحر الفضائل کی، بہرحال ان تمام امور سے واضح ہے کہ فرہنگ مذکور ۸۳۷ھ ہجری مطابق ۱۴۹۰ء سمبت میں مرتب ہو رہی تھی، تاریخ درج کرنے کے بعد مرحوم شیرانی صاحب نے لکھا ہے[4]:

"دونوں کتابوں (شرح اور فرہنگ) کے درمیان ۴۲ سال کا فرق ہے جس سے یہیں

۱؎ رسالہ مخزن مارچ ۱۹۲۹ء ۲؎ ص ۸۵ ۳؎ ج ۲ ص ۲۰۰ ۴؎ مخزن مارچ ۱۹۲۹ء

قیاس کرنا چاہیے کہ شرح مخزن مجھی نے اپنی عمر کے ابتدائی زمانہ میں اور بحر الفضائل آخری زمانے میں لکھی"۔

اب ہم مطہر کڑہ کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ وہ فیروز شاہ تغلق کے دور کا مشہور شاعر تھا، اس کے دیوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی شاعری فیروز شاہ کی تخت نشینی کے قبل ہی نقطۂ عروج تک پہنچ چکی تھی، اس کا ایک ممدوح عین الملک تھا، اس کی مدح میں اس نے متعدد قصائد لکھے ہیں، ایک قصیدے میں غازیپور جانے کا پتہ چلتا ہے[1]، عین الملک محمد تغلق کے عہد میں اودھ اور ظفرآباد کا حاکم تھا، ۷۴۴ھ میں اس نے بغاوت کی تو اس کو مشرقی خطے سے الگ کرکے دہلی بلا لیا گیا[2]، اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مطہر کا قصیدہ ۷۴۴ھ سے قبل کا ہوگا، فیروز شاہ کی تخت نشینی کے قریب کے بھی قصائد کا پتہ چلتا ہے، مثلاً ایک قصیدہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کی مدح میں بعض تذکروں[3] میں نقل ہے، آخر الذکر کی وفات ۷۵۷ھ ہجری میں ہوئی[4]، ظاہر ہے کہ قصیدۂ مذکور اس سال سے کافی پہلے لکھا گیا ہوگا، حضرت چراغ دہلی کی وفات پر ایک پر درد مرثیہ لکھا ہے جو دیوان کے علاوہ بعض اور مقامات پر بھی نقل ہوا ہے[5]، ایک قصیدہ جو ۷۸۹ھ میں لکھا گیا اس میں اپنی عمر ۷۳[6] سال بتائی ہے، اس سے واضح ہے کہ اس کی پیدائش ۷۱۶ھ کے قریب ہوئی ہوگی، ان تمام امور کا قطعی نتیجہ یہ ہے کہ مطہر اور شارح مخزن الاسرار دو الگ شخصیتیں ہیں، اس لیے کہ شارح مخزن نے ۸۳۷ھ میں فرہنگ بحر الفضائل تالیف کی ہے، اس وقت مطہر کی

۱؎ مثلاً بیت یہ ہے: لیک چوں مدت حرمانست ہنوزم باقی ؛ بودہ دارالملک الشرق سوی غازیپور

۲؎ منتخب التواریخ بدایونی ج ۱ ص ۲۳۴ ۳؎ مثلاً دیکھئے اخبار الاخیار ص ۸۳ و ۸۴ ۴؎ ان کی وفات کی تاریخ ۱۸ رمضان ۷۵۷ھ ہے، دیکھئے مقدمہ خیر المجالس ص ۶۱ ۵؎ تاریخ محمدی اور اخبار الاخیار میں منقول ہے، دیکھئے مقدمہ مذکور ص ۶۵ و ۶۶

۶؎ ابو الفتح ناصر الدین محمد شاہ کی مدح ہے جو فیروز شاہ ہی کی زندگی میں ۷۸۹ھ میں تخت نشین کر دیا گیا تھا، بیت یہ ہے:

من ہم چو دیدم اینکہ چو ہفتاد و سہ گذشت ؛ عمر و فلک بر نیت کہ پشتم دوتا کند

عمر ۱۲ سال کی ہوگی، بالفاظ دیگر ان دونوں شخصوں کے درمیان عمروں کا تفاوت دونوں کے ایک ثابت ہونے میں مانع ہے، پروفیسر شیرانی شرح مخزن کو جو ۹۹۵ھ میں تالیف ہوئی، شارح کی ابتدائی تالیف قرار دیتے ہیں، وہ مولف کی دونوں تالیفات کے درمیان ۴۲ سال کی مدت کی بنا پر ایک کو اوائل عمر اور دوسری کو اواخر عمر کی تالیف قرار دیتے ہیں حق بجانب ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ مطہر جس کی پیدائش ۹۱۶ھ کے قریب ہوئی اور جو ۹۴۲ھ سے قبل شاعری کی دنیا میں پوری طرح روشناس ہو چکا ہو، وہ ۹۵۳ھ کی تالیف کا مصنف نہیں ہو سکتا، خلاصۂ کلام یہ کہ مطہر کڑہ اور شارح مخزن ایک شخص نہیں ہیں،

(۲) شارح مخزن اور مطہر کڑہ کے ناموں میں فرق ہے، اول الذکر کا پورا نام محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود ہے، اور مطہر کے اصل نام کا پتہ ہی نہیں، شارح مخزن کے نام میں مطہر شامل نہیں ہے، عرشی صاحب کے پیش نظر ایک نسخے میں اور پٹیالہ کے ایک دوسرے نسخے میں محمد کے بجائے مطہر ہے، ان کے علاوہ تمام نسخوں میں محمد ہی نام ملتا ہے، جو صحیح معلوم ہوتا ہے، اس کی صحت کے قرائن یہ ہیں:

(۱) شرح کے دو نسخوں کے علاوہ باقی تمام نسخوں میں یہی نام ہے،

(۲) قاضی ابراہیم تتوی نے بلخی کی شرح سے بہت استفادہ کیا ہے، وہ بھی شارح مخزن کا نام محمد بلخی[1] ہی لکھتے ہیں،

(۳) بحر الفضائل کے تمام نسخوں میں مولف کا نام محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود درج ہے[2]، اس سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ شارح مخزن کا نام محمد ہے، مطہر اس کی تصحیف ہے، اس لیے جب دونوں نام الگ الگ ہیں تو دونوں کے ایک ہونے کا ادنیٰ قرینہ بھی باقی نہیں رہتا۔

---

[1] عرشی صاحب جس کو نامعلوم شرح نگار لکھتے ہیں وہ غالباً یہی بزرگ ہیں، انھوں نے بلخی کے مطالب کو ذرا سی تبدیلی کے بعد اپنی شرح میں شامل کر لیا ہے، دیکھئے خاتمۂ مخزن الاسرار طبع تہران، مزید دیکھئے معارف جولائی ۱۹۶۷ء ص ۴۲

(۳) شرح مخزن الاسرار میں کم از کم ایک بار مطہر کا ذکر اس طرح آیا ہے:-

"افضل العصر مولانا مطہر گوید"

اس عبارت کے آخری دو لفظوں میں مختلف نسخوں میں اختلاف ہے، میرے پیش نظر[1] نسخے میں یہی ہے، رضا لائبریری میں دو نسخے ہیں[2]، ایک میں گوید اور دوسرے میں فرماید ہے، مطبوعہ نسخے میں[3] مطہر کے بجائے ظہیر ہے، اس سے واضح ہوا کہ شارح مخزن اور ظہیر فاریابی ہم عصر نہیں ہیں، اس بنا پر مطبوعہ نسخے میں "ظہیر" کو چھاپے کی غلطی پر محمول کرنا چاہیے، عرشی صاحب نے ناحق ظہیر فاریابی کے دیوان کی چھان بین کی، جبکہ ظہیر شارح سے دو صدی متقدم ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ شارح مطہر کو اپنے دور کے اہم فاضلوں میں شمار کرتا ہے، اسی بنا پر وہ شاعر سے الگ ہو جاتا ہے، شارح مخزن اسرار اپنے ایک دوسرے معاصر مغیث ہانسوی کو بھی افضل العصر[4] قرار دیتا ہے، اس سے اس قیاس کو مزید تقویت پہنچتی ہے کہ "افضل العصر" کاتب کا اضافہ نہیں، بلکہ خود شارح کا فقرہ ہے۔

عرشی صاحب نے اس سلسلے میں دوسرے طور پر[5] استدلال کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"میری رائے میں اصل نسخے میں یہ عبارت ہوگی "بندۂ احقر مطہر گوید" کسی ناقل نے افضل العصر مولانا مطہر گوید لکھا ہوگا، جو اصحاب عربی زبان سے ناواقف ہیں انھوں نے اس قسم کا تغیر عربی کتابوں کے دیباچوں میں بارہا دیکھا ہوگا کہ مصنف نے جہاں اپنے لیے انکسار کے الفاظ لکھے تھے، وہاں شاگردوں نے کتاب نقل کرتے وقت تعظیمی الفاظ درج کیے ہیں"

عرشی صاحب کے اس طرز استدلال کے متعلق کچھ کہے بغیر عرض ہے کہ جب شرح کے تمام نسخوں میں

---

[1] برٹش میوزیم کے نسخے کا عکس ہے [2] نمبر ۵۹، ۶۰ ہے [3] دیکھئے معارف اگست ۱۹۶۷ء ص ۹۳

[4] معارف جولائی ۱۹۶۷ء ص ۴۵ [5] معارف اگست ۱۹۶۷ء ص ۹۲

افضل العصر ہو اور یہ فقرہ شارح نے اپنے دوسرے معاصرین کے لیے استعمال کیا ہو تو اس کو مصنف کا جو ہو فقرہ نہ سمجھنے پر اصرار، کمزور استدلال ہے۔ البتہ اس سلسلے میں اگر کوئی اور قرینہ بھی ہوتا تو بات دوسری ہوتی، ورنہ تنہا یہ استدلال صرف کمزور ہی نہیں بلکہ قابلِ ترک بھی ہے۔

تفصیلات بالا سے واضح ہے کہ مطہر کڑہ اور محمد مجی شارح "مخزن الاسرار" کے ایک ہونے کے قرائن تقریباً بے بنیاد ہیں۔ ذیل میں محترمی عرشی صاحب کے دلائل و قرائن کے سلسلے میں کچھ معروضات پیش کیجاتی ہیں۔

میرے خیال میں ان کے دلائل میں کوئی دلیل ایسی نہیں جو خود مکتفی ہو۔ اگر ایسی کوئی شہادت ہوتی تو پھر ان کے پیش کردہ قرائن مستحکم اور بڑی حد تک قابل قبول ہوتے، لیکن اس قسم کی شہادت نہ ہونے سے عرشی صاحب کے پیش کردہ دلائل بے معنی رہ جاتے ہیں، ہم وطن اور ہم عصر ہونا ایک ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے، بشرطیکہ نام بھی ایک ہو، باپ دادا اور خاندان کے دوسرے افراد بھی ایک ہوں اگر یہ آخری چیزیں نہ ہو تو ہم وطن اور ہم عصر ہونا بے معنی ہے، ایک جگہ اور ایک ہی دور میں لاکھوں آدمی رہتے ہیں، سب ایک نہیں ہو سکتے، لیکن ان لاکھوں آدمیوں میں اگر کوئی دو ایسے ہوں جن کا نام ایک ہی ہو[1]، ان کے باپ دادا کا بھی ایک ہی نام اور لقب ہوتا تو البتہ دونوں کے ایک ہونے کا قوی قرینہ ہوگا، محترمی عرشی صاحب نے شارح "مخزن الاسرار" اور مطہر کے نام کے ایک ہونے پر کوئی قابل ذکر بحث نہیں کی، انھوں نے محض ایک نسخے کی بنیاد پر شارح کا نام مطہر قرار دیدیا، اور اس ترجیح اور انتخاب کی تائید میں کوئی ادنی بات بھی نہیں پیش کی، اس لیے ان کے استدلال میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا، اور جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں، شارح کا نام مطہر نہیں محمد تھا، اس کا پورا ثبوت شرح کے مختلف نسخوں کے علاوہ قاضی ابراہیم کی قدیمی

۱؎ محض نام کا ایک ہونا کافی نہیں، اس لیے کہ ایک ہی عہد میں ایک ہی جگہ ایک نام کے کئی آدمی ہو سکتے ہیں،

سند اور "بحر الفضائل" کے نسخوں کے مطالب کے ذریعہ فراہم ہو جاتا ہے، خلاصہ یہ کہ شارح کا نام محمد تھا، مطہر سے اس کا کوئی تعلق نہیں، جب دونوں کے نام الگ الگ ہیں تو زمانہ اور وطن ایک ہونے سے دو آدمی ایک نہیں ہو سکتے۔

مطہر شاعر نے اپنے کلام میں کچھ شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض شاعروں کا ذکر شرح مخزن الاسرار میں بھی ملتا ہے۔ اس سے دونوں کے ایک ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا گیا ہے، یہ کوئی دلیل ہی نہیں ہے، معاصرین اور متقدمین کا ذکر لوگ کیا ہی کرتے ہیں، اس ذکر سے دو شخصیتوں کے ایک ہونے سے کیا تعلق؟

یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ شارح "مخزن الاسرار" کی تالیف "نصاب العقلاء" اور مطہر کی طرف منسوب کتاب "نصیب اخوان" متن اور شرح کیونکر ہو گئیں، نہ عرشی صاحب نے اول الذکر کتاب ہی دیکھی اور نہ ان کو اس کے مندرجات ہی کا علم ہے، تو پھر اس کا کسی اور کتاب سے رشتہ جوڑنا بے بنیاد قیاس ہے، اس لیے قابل ترک ہے۔

رکن الدین ابو الفتح جو شرح مخزن میں ضمناً اس طرح مذکور ہیں[1]:

"عزیزی از خدمت شیخ الاسلام رکن الحق والدین ابو الفتح قدس اللہ سرہ العزیز سماع دارد"

وہ اور دیوان مطہر میں مذکور "رکن حقیقت" اگر ایک ہی ہوں (اگرچہ ان دونوں کے ایک ثابت کرنے کے قرائن بھی اپنی جگہ بہت کمزور ہیں) تو اس سے شارح اور شاعر کے ایک ہونے پر کیونکر استدلال ہو سکتا ہے، مجھے اس امر سے بھی اتفاق نہیں کہ شرح "مخزن الاسرار" میں مذکور مولانا رکن الدین ابو الفتح حضرت بہاء الدین زکریا کے پوتے ہیں،

۱؎ معارف جولائی ۱۹۴۱ء ص ۴۰

اسی طرح شارح اور شاعر دونوں کی، شاعری و علمی فضیلت میں شرکت سے دونوں کا ایک ہونا کیونکر لازم ہوگا، یہ استدلال بھی بغیر کسی معاون دلیل کے بے بنیاد ہے،

خلاصہ یہ کہ عرشی صاحب کے یہاں کوئی مضبوط دلیل نہیں، انھوں نے اس اہم بحث کو کہ شاعر اور شارح دونوں کا ایک ہی نام تھا تشنہ چھوڑ دیا ہے، اس کی بنا پر ان کے سارے قرائن ضعیف اور قابلِ ترک ہو جاتے ہیں، جب نام ہی الگ ہوں تو پھر ایک ہونے کا کیا ذکر؛

اس کے برخلاف راقم سطور کے نزدیک مظہر کڑہ اور شارح "مخزن الاسرار" کے دو الگ الگ شخص ہونے کے زبردست قرائن موجود ہیں، دونوں کے نام الگ ہیں، شارح اپنا نام مع اپنے اجداد کے نام کے ہر جگہ ذکر کرتا ہے، مظہر کے پورے دیوان میں اس تخلص کے سوا کچھ اور نہیں ملتا، پھر دونوں کی عمروں میں تفاوت ہے، اور آخری بات یہ کہ شارح مظہر کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ وہ الگ معلوم ہوتا ہے،

اب عرشی صاحب کے بعض ایسے امور کی طرف توجہ کی جاتی ہے جو موضوع سے براہ راست متعلق نہیں، مگر ضمنی طور پر ان پر گفتگو ہو چکی ہے،

۱- وہ بدر خزانہ البلخی کو بدر الدین البلخی سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک بدر خزانہ کتابت کی غلطی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:[1]

"بدر الخزانہ کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ شارح کا لقب ہے، جو اصل میں بدر الدین تھا، موجودہ نسخوں کے منقول عنہ میں 'الدین' کو خطی مشابہت کے باعث الخزانہ یا الحزانہ پڑھا گیا ہوگا، اس کے بعد یہی لفظ مروج ہو گیا"

عرشی صاحب کا استدلال اس لیے کمزور ہے کہ قطع نظر اس امر کے کہ شرح مخزن کے سارے

لہ معارف اگست ۱۹۴۱ء ص ۸۰

نسخوں میں "بدر الخزانہ" پایا جاتا ہے، خود "بحر الفضائل" کے نسخوں میں بھی یہی قرأت ملتی ہے، پروفیسر شیرانی مرحوم کے پیش نظر بحر الفضائل کا جو نسخہ تھا وہ بہت قدیم تھا، اور ان کا خیال ہے کہ شاید یہ مصنف کے عہد ہی کا ہو،[1]

"بحر الفضائل کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ نویں صدی ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے، اور کوئی تعجب نہیں اگر خود مصنف کے عہد میں نقل ہوا ہو، اس میں املا کی وہ تمام خصوصیات جو نویں صدی کے منتصف اول میں رائج تھیں، موجود ہیں"

ایسے قدیم نسخے میں بدر الخزانہ ہے، اس کے علاوہ شارح مخزن الاسرار اور مولف بحر الفضائل کا لقب فضل الدین[2] تھا نہ بدر الدین، یہ لقب ان دونوں کتابوں کے متعدد نسخوں میں موجود ہے، ان وجوہ کی بنا پر نہ یہ صحیح ہے کہ بدر الخزانہ بدر الدین کی غلط خوانی کا نتیجہ ہے نہ یہ کہ بدر الدین مؤلف کا لقب تھا،

(۲) مولانا جمال الدین استباجی کے بجائے مولانا جمال الدین استاجی ہونا چاہیے، یہ اپنے دور کے نامور عالم اور شاعر تھے، ان کی مدح میں مظہر کڑہ نے ایک قصیدہ[3] لکھا ہے، چار قصیدے راقم الحروف کو دستیاب ہو چکے ہیں، جو "فکر و نظر" بابت اپریل ۱۹۶۵ء[4] میں شائع ہو چکے ہیں،

(۳) محمد تغلق شاہ نے خرگاہ کا نام خرمگاہ تجویز کیا تھا، عرشی صاحب کو اس دور کی تاریخوں میں یہ لفظ نہیں مل سکا،[5] مگر حافظ محمود شیرانی صاحب نے شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی (ص ۱۷۱) سے یہ جملہ نقل کیا ہے:

"بر این نواح آگاہی داد تا خواجۂ جہان را دریں چوڈول سوار کنند

لہ دیکھئے رسالہ مخزن بابت ماہ اپریل ۱۹۲۹ء ۲ے دیکھئے فہرست کتاب خانۂ مرکزی دانشگاہ تہران، ج ۱۱ نمبر ۳۲۶۹ ۳ے یہ قصیدہ ۲۳ شعر کا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ استاجی بڑے پائے کا عالم تھا، قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے: جمال الدین ای استاد استاج ؛ در تو کعبۂ علم است و ما حاج ۴ے ص ۱۹-۲۷ ۵ے معارف اگست ۱۹۴۱ء ص ۹۷

ودرخرم گاہ بر ند"[1]

سے کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ خرمگاہ فارسی ادب میں پہلے سے موجود تھا اور کم وبیش خرگاہ کے معنی میں مستعمل بھی تھا، فرہنگ جہانگیری (ج ا ص ۹۳۳) میں لکھا ہے: خرمگاہ و خرمگہ خرگاہ کو گویند شمس فخری (صح جندی) راست: از علو ہمت فراش خرمگاہ قدر خیمہ قدر زد بر اوج از ادنی خیزدہ۔ سروری نے مجمع الفرس (چاپ تہران ج ا ص ۶، ۴۸۰، ۴) میں چند اور قدیم مثالیں جمع کی ہیں: خرمگاہ و خرمگہ (ہر دو بضم خا و فتح رای مہملہ شدہ دو مخفف و کاف فارسی) یعنی خرگاہ مثال اول تخفیف) حکیم خاقانی گوید:

آتش رخسار تو از راہ چشم   کرد خرمگاہ دل از ارغوان

شمس جندی نیز گوید: از علو ہمت فراش خرمگاہ قدر زد. مثال دوم عمید تولکی گوید:

گہی صحن ہوا خرمگہ اوست   گہی در دامن کوہش مآب است

واضح ہو کہ خاقانی اور عمید دونوں محمد شاہ تغلق سے پہلے کے ہیں، عمید کا تعلق غلام خاندان کے بادشاہوں سے تھا لیکن مولف فرہنگ رشیدی نے خرمگاہ کو غلط بتایا ہے، وہ لکھتا ہے (طبع تہران ص ۵۸۶) "خرمگاہ و خرمگہ یعنی خرگاہ و تخفیف را نیز آمدہ، بدانکہ صحیح خورنگاہ است۔ خرمگاہ مخفف خورنگاہ و چنانکہ بیاید۔" پھر ص ۶۲۱ پر لکھتا ہے: "خورنگہ و خورنگاہ پیشگاہ و ایوان یعنی جائے خور، خورنق معرب آن، و بعضی گفتہ اند مخفف خورنگاہ چہ ملوک سابق طعام در پیشگاہ می خوردند و قیصری کہ نعمان بن منذر برای بہرام گور بنا کردہ بود بنا بران خورنگہ می گفتند کہ در آں طعام می خورد ..... خاقانی گوید:

خواہی کہ در خورنگہ دولت کنی طواف   بگریز از این خرابہ ناوگشتہ ہی خاک

عبد الواسع جبلی گوید: از خوبی و خوشی چو سہ دیر و خورنگہ است   مشہور در مداین و معروف در کور"

رشیدی نے جو تفصیل پیش کی ہے اس سے خورنگہ اور خورنگاہ کی تائید و تصدیق ہوتی ہے، لیکن اس نے اپنے اس دعوی کہ "خرمگاہ" غلط ہے، کوئی ثبوت نہیں فراہم کیا ہے، بلکہ بعد میں اس کا ذکر تک نہیں کیا، چونکہ شعرائے متقدم نے یہ لفظ استعمال کیا ہے، اس بنا پر صاحب رشیدی کے لیے سوائے خاموشی کے اور کوئی چارہ نہ تھا، اور جب تک یہ ثابت کر دیا جائے کہ ان شعرا کے کلام میں لفظ خرمگہ یا خرمگاہ محرف یا مصحف ہے اس وقت تک ان کے وجود کے متعلق کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا، خلاصہ کلام یہ کہ خرم گاہ یا خرمگہ جو محمد بن تغلق کے دور سے پہلے ہے اور محمد بن قوام نے اس لفظ کے سلسلے سے شرح مخزن میں جو تفصیل لکھی ہے وہ درخور اعتنا نہیں۔

(۴) عرشی صاحب نے شارح اور شاعر دونوں کا وطن کڑہ مانک پور بتایا ہے، ظاہر ہے کہ مانک پور کا اضافہ غلط ہے، فی الحال ہم نہیں کہہ سکتے کہ شاعر کا وطن اسی الہ آباد والے کڑہ میں تھا یا کسی اور میں، لیکن شارح کے متعلق تو تھوڑا سا اشکال ضرور ہے، حافظ محمود شیرانی نے اپنے مضمون[1] میں متن میں تو اس کا وطن کڑہ ہی قرار دیا ہے لیکن اسی صفحے کے حاشیے میں اضافہ کرتے ہیں[2]:

"کری احمد آباد کے قریب ایک قصبہ کا نام بھی ہے، جو سلاطین گجرات کے عہد میں بہت مشہور تھا، مرآت سکندری، آئین اکبری، فرشتہ اور طبقات اکبری میں اسکا ذکر آتا ہے، تاریخ فیروز شاہی ص ۵۱۸ میں اس کو ایک جگہ کڑہ لکھا ہے، اور دوسرے مقام پر کڑہ بیتی، لیکن صحیح نام کری ہے، کری سے کری نسبت آسانی کے ساتھ بنجاتی ہے اور ظن غالب ہے کہ مصنف اسی کری کی طرف منسوب ہے، کری قصبہ ہونے کے علاوہ پرگنہ بھی تھا (دیکھئے مرآت سکندری ص ۳۵-۳۴، ۳۳۰)

اس لیے بہت ممکن ہے کہ شارح "مخزن الاسرار" گجرات کے کری کا باشندہ ہو، اسکے وجوہ حسب ذیل ہیں:

(ا) بحر الفضائل میں جوابات (باب ششم) ہندی اوزان و دینار و درہم پر ملتا ہے، اس میں مولف نے گرامنطرہ کے اوزان کا دہلی کے اوزان سے مقابلہ کیا ہے، مولف نے دہلی کو "آن دیار" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اگرچہ اسکے بیان سے ظاہر ہے کہ اسکا وطن سلطنت دہلی کے ماتحت تھا، ظاہر ہے اس زمانے میں گجرات پر سلطنت دہلی کا قبضہ مسلم تھا، الہ آباد کے قریب کا رہنے والا دہلی کے لیے آن دیار کا فقرہ مشکل سے لکھے گا، لیکن یہ محض ظن ہے یقین نہیں۔

(ب) "بحر الفضائل" کا قدیم ترین دریافت شدہ نسخہ جو حافظ محمود شیرانی کی ملک میں تھا، وہ گجرات ہی میں لکھا گیا، اس سے بھی اس کے وطن کی طرف ہلکا سا اشارہ سمجھا جا سکتا ہے۔

ضمناً عرض ہے کہ مطہر کو بعض جگہ مطہر گجراتی کہا گیا ہے، اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ اس شاعر کا تعلق الہ آباد کے نزدیک والے کڑہ سے نہ تھا، بلکہ گجرات والے سے رہا ہوگا، مگر حقیقت یہ ہے کہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی[1]، بدایونی[2] اور آزاد بلگرامی[3] وغیرہ نے اس کا وطن کڑہ ہی لکھا ہے، کری (گجرات) نہیں، بدایونی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مطہر کی اولاد لکھنوتی میں اس کے عہد تک عزت کی زندگی بسر کرتی رہی ہے۔

---

[1] رسالہ مخزن لاہور، مارچ ۱۹۲۹ء ص ۲ [2] دیکھئے اخبار الاخیار ص ۸۳، تذکرۃ المصنفین دہلی ص ۱، [3] منتخب التواریخ ج ا ص ۲۵۰، [4] ید بیضا نسخہ علی گڑھ ص ۲۵۲

تہذیب کی تشکیل جدید

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۲)

تشکیل جدید میں ایک ذی شعور طاقت ابتدا ہی سے موجود ہے

تشکیل جدید میں ایک ذی شعور طاقت ابتدا سے موجود ہے اور تحت الشعور کی ماہیت و نوعیت میں اسی کی عبادت و اطاعت کا جذبہ ہے، جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہے،

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (ذٰریت - ۲)	میں نے جن اور انس کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اگر تحت الشعور میں جنسی خواہش یا غلبہ و اقتدار کا جذبہ ہوتا تو دونوں کی آزادانہ تسکین سے سکون و اطمینان حاصل ہونا چاہیے تھا، حالانکہ تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہے کہ یہ آزادی حرص و ہوس کی آگ بھڑکا کر انسان کو زیادہ پریشان و غیر مطمئن بنا دیتی ہے، اس کے برخلاف عبادت و اطاعت سے جو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ اس قدر قطعی و یقینی ہے کہ خود خدا نے بھی عابدوں اور زاہدوں کی عبادت و ریاضت سے نفس کے مختلف حصوں میں رد و بدل قبول کیا ہے، اور کہا ہے کہ بعض طبقات کی تسکین دوسری چیزوں سے بھی ہو سکتی ہے، قرآن حکیم میں ہے:

أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد - ۴)	غور سے سن لو اللہ ہی کی یاد سے دل مطمئن ہوتے ہیں،

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عبادت و اطاعت سے تحت الشعور کا صحیح ربط قائم ہو جاتا ہے جو تسکین کی کسی اور شکل سے نہیں قائم ہوتا ہے، ربط قائم ہونے میں اس قول و قرار کو بھی دخل ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے

واذ اخذ ربك من بنی آدم من ظهورهم ذریتهم	اور جب آپکے رب نے اولاد آدم کی پشت
واشهدهم علی انفسهم الست	سے انکی اولاد کو نکالا اور ان سے ان ہی کے
بربکم قالوا بلی	متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟
(اعراف - ۲۲)	سب نے کہا بیشک آپ ہمارے رب ہیں،

غلبۂ نفس کی نشاندہی

جنسی خواہش کا تعلق حیوانی جبلت سے ہے، لیکن نفس انسانی میں ایک ایسے مقام کی نشاندہی ملتی ہے، جس میں یہ خواہش تحت الشعور پر چھا جاتی ہے اور اس قدر غلبہ حاصل کر لیتی ہے کہ اس کی ماہیت و نوعیت کا شبہہ ہونے لگتا ہے، قرآن حکیم میں اس مقام کی نشاندہی موجود ہے:

افرأیت من اتخذ الٰهه هواه	کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے اپنا
(جاثیہ - ۲)	معبود اپنی خواہش کو بنا رکھا ہے

یہ خواہش اپنا مستقل مذہب ایجاد کر لیتی ہے.

ان هی الا اسماء سمیتموها انتم	یہ معبود محض نام ہیں جنکو تم نے اور تمھارے باپ
وآباؤکم ما انزل اللّٰه بها من سلطٰن	دادا نے رکھ لیا ہے، اللہ نے اسکی کوئی دلیل
(نجم - ۱)	نہیں بھیجی

اس حالت کے اعمال نہایت دلکش اور دلپسند معلوم ہوتے ہیں

زیّن لهم الشیطان اعمالهم (نحل ۲)	شیطان نے ان کیلیے انکے کاموں کو دلکش بنا دیا ہے

لیکن حیات انسانی کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں، اور حیات حیوانی کو پورا غلبہ حاصل ہو جاتا ہے، اور خواب و خیال اور اعصاب تک میں اس کی نمود ہونے لگتی ہے، اس حالت کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے:

ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم — اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی

وعلی ابصارھم غشاوۃ (بقرہ - ۱) — ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے،

دوسری جگہ ہے

بل طبع اللہ علیھا بکفرھم (نساء - ۲۲) — بلکہ اللہ نے کفر کی وجہ سے انکے دلوں پر مہر لگا دی ہے،

غالباً فرائڈ نے اسی مقام کی تحقیق کی ہے، جس میں ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ علم و فلسفہ اور اخلاق وغیرہ بھی جنسی خواہش کے بہلانے کا ذریعہ قرار پا سکتے ہیں

روح و حیات کی سراغ رسانی کے بغیر نفسیاتی تکوین ٹھیک ہوگی اور نہ انسان کا مقام واضح ہوگا

یہ ناکامی تحت الشعور تک محدود نہیں ہے، بلکہ روح و حیات کے بارے میں بھی مغرب کی تحقیقات صفر کے برابر ہے، حالانکہ ان سرچشموں کی سراغ رسانی کے بغیر نہ تہذیب کی نفسیاتی تکوین ٹھیک ہوگی اور نہ کائنات میں انسان کا مقام واضح ہوگا۔

تحقیق کی ابتدا مادہ سے ہوئی اور تین چار سو سال کے بعد اب ایک ایسی "توانائی" کی دریافت ہو گئی ہے جس کی حقیقت ماورائے مادہ ہے

لیکن چونکہ ابھی ماورائے مادہ پرواز کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے، اس بنا پر یہ توانائی نہایت موہوم اور دھندلی شکل میں ہے، اور اس کے بغیر نفس انسانی کے بہت سے گوشے خالی پڑے ہیں،

نفس انسانی کی مثال تاریک کوٹھری جیسی ہے، اس میں جب تک روشنی نہ ہو محض آنکھ کی بینائی سے کام نہیں چل سکتا، اگر روشنی کے بغیر تحقیق و ریسرچ کی کوشش ہوئی تو بعض چیزیں تو گرفت میں آجائینگی مگر بعض جستجو کے باوجود نہ مل سکیں گی، پھر جو چیزیں گرفت میں آئی ہیں ان میں سے بعض کی حقیقت دریافت ہو جائے گی اور بعض بلا حقیقت رہ جائیں گی، یا خلاف حقیقت ان کی دریافت ہوگی،

تشکیل جدید میں ان دونوں کا سرچشمہ ربانی توانائی ہے

تشکیل جدید میں یہ "توانائی" زندہ و جاوید ہے، خالق و مالک اور "فعال لمایرید" ہے، ہر شی کا مبدا و منتہا اور خود غیر محدود و بے نہایت ہے، اس کی جانب

پرواز کی واضح شکل موجود ہے، اس نے نفس انسانی (تاریک کوٹھری) کو منور کرنے کا بھی انتظام کیا ہے، دراصل حیات و روح حیات کا سرچشمہ یہی "توانائی" ہے جس کا اصطلاحی نام "اللہ" ہے۔ قرآن حکیم میں ہے

الذی خلق الموت والحیاۃ (الملک - ۱) — وہ ذات جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا

دوسری جگہ ہے

قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ (یٰسین - ۴) — آپ کہدیجئے ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی بار ان کو پیدا کیا ہے،

یہی روح حیات خلق کے ساتھ مخلوق کی ہدایت کا فرض بھی انجام دیتی ہے، فرعون نے جب موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا

فمن ربکما یموسیٰ (طٰہٰ - ۲) — اے موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے؟

تو موسیٰ نے جواب میں خصوصیت کے ساتھ ان دونوں صفتوں کا ذکر کیا،

قال ربنا الذی اعطی کل شیٔ خلقہ ثم ھدیٰ (طٰہٰ - ۲) — موسیٰ نے جواب دیا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شی کو اسکی پیدائش عطا کی اور راہ بتائی۔

اور ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا

الذی خلقنی فھو یھدین (شعراء - ۵) — رب وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی میری ہدایت کرتا ہے۔

ایک اور جگہ ہے

الذی خلق فسوّیٰ والذی قدّر فھدیٰ (اعلیٰ - ۱) — رب وہ ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور درست کیا جس نے اندازہ کیا اور راستہ بتایا،

روح حیات کے بارہ میں ارشاد ہے:

ثم سوّٰہ ونفخ فیہ من روحہ وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ

(سجدہ - ۱)

پھر اللہ نے انسان کو درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونک دی اور تمہارے لیے کان آنکھ اور دل بنایا،

دوسری جگہ ہے

فاذا سویتہٗ ونفخت فیہ من روحی فقعولہ سٰجدین

(حجر - ۱)

پھر جب میں انسان کو درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم (فرشتے) سجدہ میں گر پڑو۔

فطرت ربانی توانائی کا مظہر ہے جس نے انسان کی اصل نورانی بنادی ہے

تحت الشعور، حیات اور روح حیات کی دریافت کے بعد نفسیاتی تکوین میں ایک ربانی توانائی کی کارفرمائی مسلم ہوجاتی ہے، اور انسان کے اصل مقام کی تعیین میں زیادہ دشواری نہیں رہتی،

مذکورہ فطرت اسی ربانی توانائی کا مظہر ہے، جس نے انسان کو "نورانی" بنادیا، اور اسکی جہت میں بنیادی تبدیلی پیدا کردی، اور انسان کے ذرائع علم، تجربات ومشاہدات میں محدود نہیں رہ گئے بلکہ مغیبات کے نام سے فیضان علم کا ایک مستقل سرچشمہ کھل گیا،

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

طرق العلم ثلثۃ الاخذ من المحسوسات والانتقال من المعلوم الی المجہول والتلقی من الغیب (فیقات ۳۰)

علم کے تین راستے ہیں (۱) محسوسات سے علم حاصل کرنا (۲) معلوم سے نامعلوم کی طرف پہنچنا اور (۳) غیب سے علم حاصل کرنا،

انسان کی قیادتِ عظمیٰ

اس سرچشمہ نے کائنات میں انسان کو جس مقام کی نشاندہی کی ہے، اس میں کوئی اور مخلوق اس کی سہیم وشریک نہیں ہے، یعنی جس طرح "ربانی توانائی" وحدہ لاشریک ہے، اسی طرح اس کا عکس اور پرتو بھی اس وصف میں لاشریک ہے، وہ ربانی توانائی کی نیابت اور کائنات کی قیادت کے منصبِ عظمیٰ پر فائز ہے،

اِنِّی جاعلٌ فِی الاَرضِ خلیفۃ

میں زمین میں نائب مقرر کررہا ہوں،

اس منصب کے استحقاق کے لیے جن صفات کا حامل ظرف درکار ہے وہ کسی اور مخلوق کو میسر نہ تھا، اس لیے اس پیشکش کو قبول کرنے سے ساری کائنات نے انکار کردیا

اِنّا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان

(احزاب - ۱۹)

ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے "امانت" پیش کی، ان سب نے اٹھانے سے انکار کردیا، لیکن انسان نے اس کو اٹھالیا،

عارفین نے کہا ہے:

"استحقاق انسان مرتبۂ خلافت را بنا بر کمال قابلیت اوست صفات متقابلہ را بر وجہی کہ مظہر اسمائے متقابلۂ الٰہی تواند شد وبعمارت عالم صورت ومعنی قیام تواند نمود"[1]

مغرب کے آئینہ میں انسان ہی کا صحیح عکس نہیں نظر آتا ہے

انسان کو اصلی مقام میں متعین ہونے کے بعد ایک ایسے آئینہ کی ضرورت ہے جس میں ماورائے مادہ کا عکس بھی منعکس ہوتا ہو،

مغرب کے پاس عکاسی کے لیے ایک آئینہ ضرور موجود ہے مگر وہ سراسر مادی ہے، اس لیے اس میں ماورائے مادہ کا عکس نظر نہیں آتا، اس "آئینہ" میں انسان جیسا نظر آیا اس کے لحاظ سے اس کے قیام وبقا کی صلاحیت کا معیار مقرر کرنے میں مادہ سے آگے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

چنانچہ بقاء اصلح کے اصول کے مطابق انسان کی ساخت وپرداخت کے ہر مرحلے میں مادیت ہی

[1] اخلاق جلالی

سرایت کی ہوئی ہے اور انسانی صلاحیت میں مادی طاقت کے علاوہ کسی کو کوئی دخل ہے اور نہ صالح بننے کے لیے اخلاقی اقدار کی کوئی اہمیت ہے، بلکہ "صالح" وہ ہے جو فتحیاب ہو کر بقا حاصل کرے، خواہ اس کے اخلاق و کردار درندے جیسے ہوں، اور غیر صالح وہ ہے جو شکست کھا کر ناکام و نامراد ہے، اگرچہ وہ فرشتہ جیسے صفات سے متصف ہو،[1]

اس اصول سے حیوان و انسان میں شعوری مماثلت ثابت کی گئی ہے، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس مماثلت میں انسان حیوان کی سطح پر ہے یا حیوان انسان کی سطح پر یعنی اعلیٰ ادنیٰ کے اندر ہے یا ادنیٰ اعلیٰ کے اندر ہے،

جو لوگ انسان کو حیوان کے مماثل مانتے ہیں وہ اقدار و خصائص کو حیوان کے نفسیاتی اعمال اور سابقہ عضوی کیفیات سے اخذ کرتے ہیں، یہاں تک کہ ذہنی و فکری قوی کو بھی اعضا جسمانی کی طرح تدریجی ارتقا سے ظہور پذیر مانتے ہیں،

اور جو لوگ حیوان کو انسان کے مماثل مانتے ہیں وہ انسانی خصائص و اقدار کو حیوان میں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حتیٰ کہ مذہبی جذبات جیسے پاکیزہ احساسات کو بھی کتوں اور بندروں اور مکھیوں وغیرہ میں تسلیم کرتے ہیں،

تشکیل جدید میں ماورائے مادہ پرواز کا انتظام ہے

تشکیل جدید کے آئینہ میں ماورائے مادہ کا عکس بھی منعکس ہوتا ہے، اس بنا پر انسانی قیام و بقا کی صلاحیت کا معیار مقرر کرنے میں اس کے مقام کی مناسبت سے مادہ سے آگے پرواز کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اور ابتدا ہی سے اس کا اہتمام کیا گیا ہے، چنانچہ

(۱) عالم ارواح میں سب سے اس کا عہد لیا گیا ہے

[1] حکایت فلسفہ ص ۵۰۷

واذا اخذ ربک من بنی آدم من ظھورھم ذریتھم واشھدھم علی انفسھم الست بربکم قالوا بلیٰ (اعراف - ۲۲)

اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے انہیں کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں سب نے کہا بیشک آپ ہمارے رب ہیں۔

(۲) ہر ایک کے نیچرل کانسٹی ٹیوشن میں نورانی توانائی ودیعت کی گئی جس کی مدد سے حیوانی و شہوانی تقاضوں پر غلبہ اور پرواز کی راہیں ہموار ہوتی ہیں، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے،

(۳) فطرت کے اثر سے جبلت میں بھی اس توانائی کی جھلک دکھائی گئی ہے،

کُلٌّ یَّعمَلُ علیٰ شَاکِلَتِہ (بنی اسرائیل - ۸)

ای طریقتہ التی جبل علیھا

ہر ایک اپنے شاکلہ پر عمل کرتا ہے۔

یعنی اس طریقہ پر عمل کرتا ہے جس پر اس کی جبلت کی گئی ہے۔

ابتدائی نسل و آبادی کے خطاب میں بھی پرواز کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے

(۴) انسان کی ابتدائی نسل و آبادی کے خطاب میں پرواز پر خاص توجہ کی گئی ہے، کلام مجید کا ارشاد ہے:

(۱) یٰبنی آدم قد انزلنا علیکم لباسا یُّواری سوٰاتکم وریشا ولباس التقویٰ ذالک خیر (اعراف - ۳)

اے اولاد آدم ہم نے تمھارے لیے لباس مہیا کر دیا جو جسم کی ستر پوشی کرتا ہے اور زیب و زینت کا ذریعہ ہے اور تقویٰ کا لباس سب سے بہتر ہے

اس آیت میں خصوصیت کے ساتھ لباس کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی میں انسان کی عقلی زندگی کا آغاز ہو گیا تھا، اور اس کا اخلاقی شعور ابھر آیا تھا، دوسری آیت میں ہے:

(۲) یٰبنی آدم لا یفتننکم الشیطٰن کما اخرج ابویکم من الجنۃ ینزع

اے اولاد آدم کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمھیں اسی طرح بہکا دے جس طرح تمھارے ماں باپ

لباسھما لیریھما سوآتھما انہ یرٰکم	ہٹاکر جنت سے نکلوا دیا تھا اور ان کے لباس
ھو وقبیلہ من حیث لا ترونھم	اتروا دیے تھے کہ ان کے ستر انھیں دکھا دے
(اعراف - ۳)	وہ اور اس کا گروہ تمھیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم

جنت میں ٹریننگ کورس کی تکمیل کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب لباس اترنے کے بعد آدم وحوا کو اضطراب ہوا اور دونوں پتوں سے اپنی ستر چھپانے لگے۔

وطفقا یخصفن علیھما من ورق	اور وہ دونوں جنت کے پتوں سے ستر
الجنۃ (اعراف - ۳)	ڈھانکنے لگے۔

اور اس جرم کے بعد بغاوت وسرکشی کے بجائے عجز و نیازمندی کی گردن جھکا کر کہنے لگے

ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا	پروردگار ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا، اگر آپ
وترحمنا لنکونن من الخسرین	ہماری مغفرت نہ فرمائیں گے اور ہمارے اوپر رحم
(اعراف - ۳)	نہ کریں گے تو ہمارے لیے خسارہ ہی خسارہ ہے

چونکہ ماورائے مادہ پرواز میں امن و سکون مضمر اور تحت الشعور کا صحیح ربط قائم ہوتا تھا، اس لیے ابتدائی خطاب میں پرواز کی رکاوٹ دور کرنے اور حیوانی و شہوانی تقاضوں سے بچنے کی سخت تاکید کی گئی اور ماحول کو خاص سانچے میں ڈھالنے کیلئے خصوصی اہتمام کی طرف اشارہ کیا گیا، چنانچہ

یبنی آدم اما یاتینکم رسل منکم	اے اولاد آدم جب ایسا ہو کہ تم ہی میں سے میرے
یقصون علیکم اٰیتی فمن اتقی	پیغمبر پیدا ہوں اور وہ میری آیتیں پڑھکر سنائیں
واصلح فلا خوف علیھم ولا ھم	تو جو کوئی برائی سے بچیگا اور تقویٰ اختیار کریگا
یحزنون	اس کے لیے کسی طرح کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی طرح کی
(اعراف - ۴)	غمگینی ہوگی۔

مغربی تہذیب میں ارتقا کا تصور جسم انسانی پر ختم ہو گیا ہے۔

مغربی تہذیب کا انسان زندگی کی ادنیٰ شکل سے وجود میں آیا ہے، پہلے وہ بندر تھا، پھر لاکھوں سال کی مدت میں تبدریج ترقی کر کے انسان کی شکل اختیار کی ہے۔

جسمانی ترقی کی طرح ذہنی ترقی بھی تبدریج ہوئی ہے، چنانچہ تین ہزار سال پہلے کے انسان کا دماغ بچوں جیسا تھا جس میں قوت متخیلہ مفقود تھی، پھر رفتہ رفتہ ترقی کر کے انسان عاقل و ناطق کہلانے کا مستحق قرار پایا ہے:[1]

اس توجیہ میں نہ روحانیت کا تصور ہے اور نہ ابعد کے کسی اور ارتقا کا ذکر ہے، اس لیے یہ توجیہ وارتقا محض جسم انسانی تک محدود ہے اور اسکے آگے ترقی کا کوئی زینہ باقی نہیں رہتا

تشکیل جدید کی ابتدا جسم انسانی سے ہوتی ہے

تشکیل جدید میں بھی ارتقا کی ابتدا جسم انسانی سے ہوتی ہے، لیکن اس کے بعد روحانی ارتقا کا غیر محدود سلسلہ جاری رہتا ہے، یعنی مغرب کی پرواز کا جو انتہائی مقام ہے وہ تشکیل کا نقطۂ آغاز ہے اور جس جگہ مغرب کی سرحد ختم ہوتی ہے، اسی جگہ تشکیل کی ابتدا ہوتی ہے، اس کے لیے مختلف قسم کے انتظامات کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً

(۱) انسان کو عقل و تجربہ کی رہنمائی عطا ہوئی ہے اور حقائق اشیاء کا علم دیا گیا ہے،

وعلّم آدم الاسماء کلھا (بقرہ-۴)	اور آدم کو "الاسماء" کا علم سکھایا۔

مفسرین نے "الاسماء" کے مختلف معنی بیان کیے ہیں، ان میں زیادہ مناسب اشیاء کے حقائق وخواص ہیں،[2]

اسی طرح علم سے اجمالی علم مراد ہے جس سے صلاحیت کی طرف اشارہ ہے

علماً اجمالیا ولیس المراد العلم التفصیلی[3]	علم سے اجمالی مراد ہے نہ کہ تفصیلی

۱؎ تاریخ فلسفہ ص ۹۲ ۲؎ احکام القرآن ج ۱ ص ۳۳ و تفسیر مظہری ج ۱ ص ۵۰ ۳؎ تفسیر مظہری ص ۵۱

عقل و تجربہ کی رہنمائی اور علم کی بدولت ساری چیزیں انسان کے تابع فرمان کر دی گئیں، یعنی اس میں تابع بنانے کی اہلیت بخشی گئی ہے،

وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعاً منہ (جاثیہ - ۲) | اللہ نے آسمان و زمین کی ساری چیزیں تمہارے تابع فرمان کر دیں

عالم غیب کے ادراک کیلیے محسوسات کی صلاحیتیں ناکافی ہیں | (۲) ایک اور عالم سے روشناس کرایا گیا جس کے لیے محسوسات کی صلاحیتیں ناکافی ہیں، اور وہ عالم غیب ہے،

عالم الغیب والشہادۃ ھو الرحمٰن الرحیم (حشر - ۲) | اللہ غیب اور شہادت کو جاننے والا ہے وہ بیحد مہربان اور نہایت رحم والا ہے،

عالم غیب کی چیزیں خلاف عقل نہیں بلکہ ماورائے عقل ہیں، یعنی اگر محسوسات کے ادراک کے لیے عطا کیے ہوئے علم و عقل عالم غیب کے ادراک سے قاصر ہیں، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، اس لیے کہ عالم غیب ان کے حدود سے باہر ہے، اور کسی چیز کا علم و ادراک نہ ہونے سے اس کے وجود کا انکار کرنا کوئی عقل کی بات نہیں،

انسان کی یہ عادت ہے کہ جس چیز کو وہ سمجھ نہیں سکتا اس کو جھٹلانے پر آمادہ ہو جاتا ہے، حالانکہ بہت سی چیزیں انسانی علم و عقل سے ماوراء ہوتی ہیں اور جو چیزیں اس کی سرحد میں بھی ہوتی ہیں ان کو بھی ایک شخص یا ایک زمانہ کی علمی و عقلی بساط ان کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے، جبکہ دوسرے شخص کے نزدیک یا دوسرے زمانہ میں وہ مسلمات میں شمار ہوتی ہیں،

ایسی حالت میں کسی شے کے عدم ادراک کو اس کے نہ ہونے کی دلیل قرار دینا خود نرمی جہالت ہے، قرآن حکیم میں ہے،

بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما | بلکہ جھٹلایا انھوں نے اس بات کو جس کا نہ

یاتھم تاویلہ کذلک کذب الذین من قبلھم (یونس - ۴) | علم سے احاطہ کر سکے اور جس کی تاویل ابھی نہیں آئی، اسی طرح پہلے لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا،

غیب کی حقیقتوں پر ایمان لانا ضروری ہے | عالم غیب سے ربط و تعلق پیدا کرنے کے لیے اس کی حقیقتوں پر ایمان لانا ضروری ہے جس میں سب سے زیادہ اہم ربانی توانائی ہے، اور جو نفسیاتی تکوین میں دخیل ہے، اس لیے اس پر ایمان لانا سب سے مقدم ہے، اسی سے ارتقا کی غیر محدود راہیں کھلتی ہیں، اور نفسیاتی تکوین اور عملی تشکیل میں مطابقت پیدا ہوتی ہے،

ربانی توانائی کے سب محتاج ہیں | یہ ربانی توانائی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، اس کا علم سب پر محیط اور اس کی رحمت سب کو وسیع ہے، اسکی طاقت سب پر غالب اور اس کی حکومت سب پر حاوی ہے، اس کی عدالت سب کو عام اور اس کی ربوبیت سب پر یکساں ہے،

جیسا کہ خود قرآن حکیم میں ہے:

الحمد للہ رب العٰلمین الرحمٰن الرحیم ملک یوم الدین (سورہ فاتحہ) | سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہاں کا پالنے والا ہے، بیحد مہربان نہایت رحم والا بدلہ کے دن کا مالک ہے،

اس کے سب محتاج اور اس کو کسی کی احتیاج نہیں ہے، وہ کارساز و بے نیاز ہے اور اسکا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے،

قل ھو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد (اخلاص) | آپ کہہ دیجئے وہ اللہ اکیلا ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور اس کا کوئی جوڑا نہیں ہے

یہ اپنی ذات و صفات میں یکتا و یگانہ ہے، اور اس جیسا کوئی نہیں ہے،

لیس کمثلہ شئی وھو السمیع البصیر (شوریٰ - ۲)

اس کے مثل کوئی نہیں ہے، وہ سننے والا دیکھنے والا ہے،

اس توانائی کی طرف پرواز کے لیے انسان میں ایک کھڑکی موجود ہے

اس توانائی کی طرف پرواز کے لیے ابتدا ہی سے ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے، جس کا نام روح ہے،

یہ روح کیا ہے؟ اس کے بارے میں بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ ماورائے مادہ پرواز کے لیے ایک کھڑکی ہے، جو انسان میں موجود ہونے کے باوجود جسمانی وحیوانی صفات سے منزہ ہے،

ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی (بنی اسرائیل - ۱۰)

یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے روح میرے رب کے "امر" سے ہے"

اس توانائی پر ایمان سے انسان خود کو پالیتا ہے

اس توانائی پر ایمان سے انسان خود کو پالیتا ہے، جس کو ہزاروں سال کی جستجو کے باوجود نہیں پایا جاسکا.

پھر خود کو پانے کے بعد انسان کا دائرہ کار مادی دنیا تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اسکی پرواز کے لیے ماورائے مادہ ایک اور عالم درکار ہوتا ہے، جس کے مقابلہ میں یہ دنیا نہایت حقیر اور کمتر ہے.

مغربی تہذیب میں دنیوی زندگی حیات وارتقاء کی آخری کڑی ہے

مغربی تہذیب میں دنیوی زندگی کو حیات وارتقاء کی آخری کڑی قرار دیا گیا ہے، جسکے بعد موت اور فنا ہے محض ہے، جس کے بعد کسی زندگی کا وجود نہیں،

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے عقائد وتصورات اور افکار ونصب العین وغیرہ سب اسی دنیا تک محدود ہو گئے ہیں، اس کے علاوہ کسی اور عالم کا کوئی تصور نہیں ہے، اور نہ اس کی طرف پرواز کے لیے کوئی راستہ،

گویا انسان اپنے بارے میں جس مقام پر چودہ سو (۱۴۰۰) سال پہلے تھا، اسی مقام پر آج ہے

اور علم کی روشنی اپنی ذات کے بارے میں جہل کی تاریکی کو دور کرنے میں ابتک کامیاب نہیں ہوئی ہے، جیسا کہ دور جاہلیت کا عقیدہ تھا،

وقالوا ما ھی الا حیاتنا الدنیا
وما نحن بمبعوثین (انعام - ۳)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی صرف دنیوی ہے اور ہم دوبارہ نہ اٹھائے جائینگے۔

دوسری جگہ ہے:

وقالوا اذا کنا عظاما ورفاتا
ءانا لمبعوثون خلقا جدیدا (بنی اسرائیل - ۵)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور چورا چورا ہو جائیں گے تو کیا از سرنو اٹھائے جائیں گے

تشکیل جدید ایک اور زندگی وعالم کا ثبوت

تشکیل جدید میں ایک اور زندگی پر جس کا نام حیات اخروی ہے اور ایک دوسرے عالم پر ایمان ضروری قرار دیا گیا ہے جس کا نام عالم آخرت ہے

ان دونوں تک پہنچنے کے لیے ایک پل سے گذرنا ضروری ہے، جس کا نام موت ہے،

الموت جسر الی الحیاۃ الاخرویۃ اوکما قال

موت ایک پل ہے دوسری زندگی کی طرف جانے کے لیے

اس طرح زندگی میں ایک تسلسل ہے، جو موت پر ختم نہیں ہوتا ہے، بلکہ ایک منزل کے بعد موت سے دوسری منزل شروع ہوتی ہے،

یہ منزل غیر مانوس اور اجنبی نہیں ہے، بلکہ انسان اس سے شناسا ہے، اور ایک دن اس کو وہاں لوٹ کر جانا ہے،

کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتا
فاحیاکم ثم یمیتکم ثم یحییکم

تم اللہ کا کیسے انکار کرتے ہو حالانکہ تم بیجان تھے، اس نے زندگی دی، پھر وہ موت

ثم الیہ ترجعون (بقرہ-۳)	دیگا، پھر زندگی دیگا اور پھر اس کی طرف لوٹائے جاؤگے۔

یہ منزل ادیات کی نہیں بلکہ ماوراے مادہ معنویات کی ہے، اور اس میں انسان کے اچھے برے اعمال کے اچھے برے خواص ونتائج اسی طرح ظاہر ہوں گے جس طرح دنیا میں چیزوں کے خواص اور حوادث کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

جزاءً بما کانوا یعملون (سجدۃ-۲)	یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے،

یہ اچھے برے اعمال ریکارڈ ہوتے رہتے ہیں، جن کے خواص ونتائج کا ظہور ہوتا ہے،

وان علیکم لحٰفظین کراما کاتبین	اور بیشک تم پر نگہبان مقرر ہیں، عزت والے
یعلمون ما تفعلون (انفطار-۱)	عمل لکھنے والے وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو

مغرب کے ذرائع علم محسوسات تک محدود ہیں

بدقسمتی سے مغرب کے پاس کوئی ایسا ذریعۂ علم نہیں ہے جو موت کے بعد کی نشاۃ ثانیہ کر سکے، مرنے کے بعد کوئی واپس بھی نہیں آتا ہے، جو پیش آنے والے حالات سے آگاہ کرے،

اس کے پاس جو ذرائع علم ہیں اُن سب کا تعلق محسوسات سے ہے، اور مابعد کے حالات کا تعلق ماورائے محسوسات سے ہے، اس بنا پر وہ ساری مادی ترقیوں کے باوجود ان حالات سے لاعلم ہے،

انسان نہایت جلد باز ہے، جب وہ کسی شے کو نہیں جانتا یا نہیں جان سکتا تو اس کے نہ ہونے کا فتویٰ صادر کر دیتا ہے، حالانکہ بعد میں وہی شے حقیقت ثابتہ بنکر سامنے آتی ہے،

اگر یہ فتویٰ قابلِ قبول ہوتا، تو صدیوں پہلے علمی ترقیات کا دروازہ بند ہو گیا ہوتا، اور سیکڑوں چیزیں پہلے جو علم وادراک کے لیے ناممکنات میں شمار ہوتی تھیں وہ آج نہ صرف ممکن

بلکہ نگاہ کے سامنے موجود ہیں، جس طرح پہلے کی ناممکنات اب واقع ہو چکی ہیں، اسی طرح کیا عجب ہے کہ جو چیزیں آج ناممکنات میں شمار ہوتی ہیں وہ کل ثابت ہو کر رہیں، جیسا کہ بعض مفکرین (ڈپو نفیر جوڈ وغیرہ) کے اشارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اب حیات وارتقا کی اگلی منزل تلاش کرنے میں مصروف ہیں، اور بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ انسان کی اگلی منزل مادی نہیں بلکہ نفسی وذہنی ہوگی،

تشکیل جدید میں ماورائے محسوسات تک کا علم موجود ہے

تشکیل جدید میں ایک ایسا ذریعۂ علم موجود ہے جو اگلی منزل کی وضاحت کرتا ہے، اور جس کی رسائی ماورائے محسوسات تک ہے،

یہ ذریعہ "وحی" ہے، جس پر ایمان ضروری قرار دیا گیا ہے، اور جس کی رہنمائی علم وادراک کی سرحد سے بہت آگے جاتی ہے،

"وحی" سے حاصل شدہ علم ظنی وتخمینی نہیں ہوتا، بلکہ یقینی ہوتا ہے، اور زمین کے محرم کو فلک کا رازدار بنا دیتا ہے،

قل ان ھدی اللہ ھو الھدیٰ	آپ کہہ دیجیے کہ اللہ ہی کی ہدایت اصل ہدایت ہے
ولئن اتبعت اھواءھم بعد	اور اگر (بالفرض) آپ ان کی خواہشات
الذی جاءک من العلم مالک	کی اتباع کریں گے علم آنے کے بعد تو آپ کو
من اللہ من ولی ولا نصیر (بقرہ-۱۴)	کوئی اللہ سے بچانے والا اور مددگار نہ ملے گا،

وحی کا اصل موضوع "انسان" ہے، اور اس کی بحث صرف انسان کی زندگی سے متعلق ہوتی ہے جس کی ایک کڑی موت اور بعد الموت ہے،

اس علم کے بغیر نہ کائنات کا معمہ حل ہوگا اور نہ انسان کے مسائل سلجھ سکیں گے

اگر زندگی اس کی رہنمائی سے محروم رہے گی تو نہ کائنات کا معمہ حل ہوگا اور نہ انسانیت کے الجھے مسائل سلجھ سکیں گے،

اس لیے ابتدا ہی میں انسان کو اس رہنمائی سے واقف کرا دیا گیا تھا

فاما یاتینکم منی هدی فمن — اگر تمھارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے

تبع هدای فلا خوف علیهم — تو جو میری ہدایت کی اتباع کریں گے ان پر

ولا هم یحزنون ہ والذین — نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اور

کفروا وکذبوا بایتنا اولئک — جو لوگ منکر ہوں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائینگے

اصحب النار هم فیها خلدون (بقرہ ۴) — وہ دوزخ والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے

اور ابتدائی نسل انسانی سے کہدیا گیا تھا:

یا بنی آدم اما یاتینکم رسل منکم — اے اولاد آدم اگر تمھارے پاس میرے

یقصون علیکم ایتی فمن اتقی — رسول آئیں، وہ تم کو میری آیتیں پڑھکر سنائیں

واصلح فلا خوف علیهم ولا — تو جو کوئی ڈرے گا اور اصلاح کریگا توان پر

هم یحزنون (اعراف ۴) — نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

جس کے پاس وحی آتی ہے، اس کی حیثیت محض خبر رساں ایجنسی کی نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس منصب و مقام کے ساتھ وہ مامور ہوتا ہے کہ علم وحی کے مطابق انسانی تہذیب کی تشکیل اور اس کے درخشندہ نتائج و خوشگوار ثمرات کو دنیا کے سامنے بطور نمونہ پیش کرے۔

(باقی)

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(جلد چہارم)

منصب نبوت کی تشریح، قبل اسلام عرب کے اخلاقی حالات، تبلیغ نبوی کے اصول، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ کام، اسلام اور اس کے عقائد پر مفصل اور حکیمانہ مباحث

(مولفہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ) ضخامت ۵۰۶ صفحے قیمت: اٹھارہ روپیے ۱۸

منیجر

قرون وسطیٰ میں عرب و ہند کے سیاسی تعلقات

از جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب لکچرار الہ آباد یونیورسٹی

(۲)

مگر اس کے بعد یہاں قرامطہ قابض ہوگئے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

تیسری صدی ہجری کے نصف آخر میں عرب بیزار میلانات نے ایک خطرناک تحریک کی شکل اختیار کرلی جو تاریخ میں باطنی (اسمٰعیلی)، اور قرمطی تحریک کہلاتی ہے، اس کا مقصد عرب حکومت کے بجائے ایرانی سلطنت کا احیاء اور اسلامی نظام کے بجائے مجوسی مذہب کو رائج کرنا تھا، اسکے ارکان اربعہ یہ تھے: محمد بن حسین زیدان، عبد اللہ بن میمون القداح، حمدان قرمط اور ابو سعید الجنابی، کہتے ہیں کہ عبد اللہ ابن میمون القداح کی اولاد نے مصر میں جاکر فاطمیہ مصر کے نام سے ایک حریف خلافت قائم کرلی تھی، اگرچہ خود اسماعیلیوں کا عقیدہ ہے کہ فاطمیہ مصر کے مورث اعلیٰ سیدنا امام جعفر صادق کے بڑے صاحبزادے اسماعیل کی اولاد ہیں، یہ مسئلہ اپنی جگہ پر متنازع فیہ ہے، جس میں پڑنے کا یہ موقع نہیں، مگر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ فاطمیہ مصر نے صرف مصر ہی کی خلافت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پورے عالم اسلام پر قبضہ کرنے کے لیے ایک منظم اسکیم بنائی اور اس مقصد کے حصول کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں تربیت یافتہ دعاۃ روانہ کیے،

یہ دعاۃ سندھ میں بھی آئے اور یہ علاقہ ان کی سرگرمیوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا، چنانچہ حسب تصریح ابن ندیم دیبل سندھ کے ایک باشندے کو بھی اس تنظیم کی سربراہی کے لئے کوشاں

پاتے ہیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ باطنیت یا اسماعیلیت نے اس علاقہ میں کس مضبوطی سے جڑیں پکڑ لی تھیں،

لیکن چوتھی صدی کے ثلث دوم میں ایک اور انقلابی واقعہ رونما ہوا، خلافتِ بغداد پر آل بویہ کا اقتدار قائم ہو گیا اور عباسی خلیفہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے، اپنی قوم پرستی کی بنا پر شروع میں تو آل بویہ کو باطنی تحریک سے بڑی ہمدردی تھی، لیکن بعد میں ذاتی مصالح کی بنا پر اس کے خلاف ہو گئے، خاص طور پر عضد الدولہ تو اس کا جانی دشمن تھا، اس نے ایک لشکر جرار کے ساتھ مصر پر فوج کشی کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر موت نے مہلت نہ دی، اس کی موت سے فاطمی خلیفہ العزیز باللہ کے حوصلے بڑھ گئے، اس لئے از سر نو مختلف اسلامی ممالک میں اپنے دعاۃ روانہ کیے، اس واقعہ کا ایک ہمعصر مورخ عبد القاہر بغدادی لکھتا ہے:۔

فلما قضی فناخسرو نحبه طمع	فنا خسرو (عضد الدولہ) کی موت کے بعد
زعیم مصر فی ملوک نواحی المشرق	حاکم مصر (عزیز باللہ) نے مشرقی بادشاہوں
فکاتبهم یدعوهم الی البیعة	کو خطوط لکھ کر اپنی بیعت کی دعوت دی،
فاجاب قابوس بن وشمگیر عن کتابه	قابوس بن وشمگیر نے جواب دیا کہ میں تم کو صرف
بقوله انی لا اذکرک الا علی المستراح	میں یاد کرتا ہوں، ناصر الدولہ ابو الحسن محمد
واجابه ناصر الدولة ابو الحسن	محمد بن ابراہیم بن سیمجور نے عزیز باللہ کے
محمد بن ابراهیم بن سیمجور بان کتب	خط کی پشت پر "قل یا ایہا الکافرون" کی سورۃ
علی ظهر کتابه الیه یا ایها الکافرون	لکھ کر بھیج دی، نوح بن منصور والیِ خراسان
لا اعبد ما تعبدون الی آخر السورة	نے جواب میں اس کے بدعتی داعیوں
واجابه نوح بن منصور والی خراسان	کو قتل کر دیا،

بقتل دعاته الی بدعته الخ

(الفرق بین الفرق ص ۲۷۷-۲۷۹)

غرض ان دعاۃ کو ہر جگہ ناکامی ہوئی، صرف دو جگہ کامیاب ہوئے، ایک خوارزم میں، دوسرے ملتان میں۔

جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا، ۳۶۷ھ میں جب ابن حوقل یہاں آیا تھا، تو عباسیوں کا خطبہ پڑھا جاتا تھا، اس نے ملتان کے مشہور بت کا بھی ذکر کیا ہے، جس کا سبھی سیاح ذکر کرتے آئے تھے، لیکن جب ۳۷۵ھ میں دوبارہ مقدسی ملتان پہنچا تو اسماعیلیوں کو برسرِ اقتدار پایا، جو فاطمی خلیفہ مصر کے عقیدتمند تھے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

واما بالملتان فیخطبون للفاطمی	ملتان کے حکمران فاطمیہ کا خطبہ پڑھتے
ولا یحلون ولا یعقدون	ہیں، اور ان کے حکم کے بغیر کوئی کام
الا بامره وابدًا رسلهم	نہیں کرتے اور ہمیشہ اپنے قاصد اور ہدایا
وهدایاهم تذهب الی مصر	و تحائف مصر بھیجتے رہتے ہیں۔

(احسن التقاسیم ص ۴۸۵)

لیکن اس مرتبہ وہ ملتان کے مشہور بت کا ذکر نہیں کرتا اور اس کے بعد ادریسی کے سوا اور کوئی بھی اس کا ذکر نہیں کرتا، مگر ادریسی خود کبھی ہندوستان نہیں آیا، وہ یہاں کے حالات کے سلسلے میں ابن حوقل کی خوشہ چینی کا معترف ہے،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۳۶۷ھ اور ۳۷۵ھ کے درمیان ملتان میں انقلاب ہوا اور یہاں بنو منبہ کی حکومت کے بجائے اسماعیلی اقتدار قائم ہو گیا، یہ غالباً ۳۷۳ھ کے قریب کا واقعہ ہے البیرونی نے اس کا وقت تو نہیں بتایا ہے، مگر اس انقلاب کے علمبردار کا نام حلم بن شیبان بتایا ہے

وہ لکھتا ہے کہ اسی نے یا اسی کے ایما سے ملتان کا یہ مشہور بت برباد کیا گیا۔

فلما استولت القرامطة علی	جب قرامطہ ملتان پر قابض ہوگئے تو جلم
الملتان کسر جلم بن شیبان	ابن شیبان متغلب نے اس بت کو توڑ دیا
المتغلب ذالک الصنم وقتل	اور اس کے پجاری کو قتل کر دیا۔
سدنته (کتاب المقدسی ص ۵۶)	

(۱) یہ انقلاب صرف ملتان ہی میں آیا یا سندھ میں بھی آیا، اس کے متعلق ہنوز کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی، بظاہر مقدسی کی شہادت کے مطابق سندھ میں ۳۷۵ھ تک اسماعیلی قابض نہ ہو سکے تھے، اس لیے یہاں اس کے بعد ہی قابض ہوئے ہوں گے، لیکن اتنا یقینی ہے کہ یہاں بھی بعد میں قابض ہوگئے تھے، اور ان ہی سے ۴۱۶ھ میں محمود غزنوی نے سندھ (منصورہ) کو چھینا تھا، ابن الاثیر ۴۱۶ھ کے واقعات میں لکھتا ہے:

وقصد المنصورة وکان صاحبها	محمود غزنوی نے منصورہ کا قصد کیا، وہاں
قد ارتد عن الاسلام فلما	کا حاکم مرتد ہو گیا تھا، جب اس کو محمود کی
بلغه مجیٔ یمین الدولة فارقها	پیش قدمی کی خبر ہوئی تو اس نے منصورہ
واحتمی بغیاض اشبة فقصده	کو چھوڑ کر جھاڑی میں پناہ لی تو محمود
یمین الدولة من موضعین	نے بڑھ کر اس کو مع اس کے ساتھیوں کے
فاحاط به وبمن معه فقتلوا	گھیر لیا اور ان کی بڑی تعداد قتل کر دی
اکثرهم وغرق منهم کثیر ولم	اور بہت سے ڈوب کر مرگئے، بہت
ینج منهم الا القلیل	تھوڑے لوگ زندہ بچ سکے، اس کے
فرحل الی غزنة فوصلها	بعد محمود غزنہ چلا گیا اور صفر ۴۱۷ھ

عاشر صفر سنة سبع عشرة واربعمائة	میں وہاں پہنچا۔

اس کی تائید فرخی کے اس قصیدہ سے بھی ہوتی ہے جس کا مطلع ہے:

فسانہ گشت و کہن شد حدیث اسکندر　　سخن نو آر کہ نو را حلاوتیست دگر

اس قصیدہ کے عام انداز بیان سے ظاہر ہے کہ جس والی سندھ کو محمود نے شکست دی تھی وہ اسماعیلی مذہب کا پیرو تھا، فرخی اس کا نام خفیف بتاتا ہے اور لکھتا ہے:

خفیف چوں خبر خسرو جہاں بشنید　　دواں گذشت و بجیری اندر افتاد و بجیر

ان واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں سمجھنے کے لیے ہمیں ایک مرتبہ پھر دار خلافت اور وسط ایشیا کی حکومتوں کے درمیان سیاسی تعلقات پر نظر ڈالنی ہوگی، عباسی خلیفہ آل بویہ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا، جب تک وہ انھیں روپیہ دیتا رہتا، اس کی حکومت محفوظ رہتی اور جہاں اس میں کوتاہی ہوتی یا آزادی کا خواب دیکھنے کی جسارت کرتا تو تخت سے اتار دیا جاتا، ۳۸۱ھ میں بویہیوں نے الطائع للہ کو معزول کر کے القادر باللہ عباسی کو خلیفہ بنایا، مگر آل بویہ کے سب سے بڑے حریف مشرق میں بخارا کے سامانی تھے، وہ انھیں اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے، اور ان کے ہر سیاسی اقدام کی حمایت کرنے کے لیے تیار نہ تھے، لہذا سامانی حکمران منصور بن نوح اور اس کے جانشین عبد الملک بن نوح خلیفہ طائع ہی کے عقیدتمند رہے، ان کی عظمت و شوکت ایسی نہ تھی کہ القادر باللہ انھیں نظر انداز کر سکے، اس لیے اس کو ان کا زور توڑنے کے لیے ایک حریف پنجہ شکن کی تلاش تھی۔

مگر سامانی حکومت خود ضعف و اختلال کی آخری منزل سے گذر رہی تھی، امراء میں منافست برپا تھی، اس سے زیادہ اسماعیلی پروپیگنڈا جو غالباً تیسری صدی کے شروع سے سامانی حکومت کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا، اس سلطنت کا معتمد علیہ الپتگین درباری سازشوں کی وجہ سے قطع تعلق کر کے زابلستان کے غیر معروف علاقے میں اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے پر مجبور ہوا، کچھ دنوں

کے بعد اس نئی سلطنت کا وارث سبکتگین ہوا، اس کا بڑا بیٹا محمود تھا، اس لیے باپ کے بعد اس کو جانشین ہونا چاہیے تھا، مگر جو بھی وجہ رہی ہو، سبکتگین کے بعد اس کا دوسرا بیٹا اسماعیل اس کا وارث ہوا، اسے سامانی دربار کی بھی تائید حاصل تھی،

لیکن حوصلہ مند محمود نے حوصلہ نہ ہارا، اگر القادر باللہ کو سامانیوں کا زور توڑنے کے لیے مشرق میں ایک قوی بازو کی تلاش تھی تو محمود کو بھی اپنے بھائی کے مقابلہ میں قانونی استحقاق حاصل کرنے کے لیے خلیفہ کے سند جواز کی ضرورت تھی، خود خلیفہ بھی جن لوگوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا، وہ سامانیوں کو اپنی راہ میں کانٹا سمجھتے تھے، اس لیے القادر باللہ اور اس کے آقایان ولی نعمت کا مفاد اس کا متقضی تھا کہ نجیب کے مقابلہ میں انجب کی حمایت کیجائے، اس لیے القادر باللہ اور محمود کے درمیان ایک قسم کا سمجھوتہ ہوگیا، خلیفہ کی پشت پناہی سے قوی دل ہو کر محمود نے پہلے بھائی سے تخت چھینا، پھر اپنے قدیم خاندانی ولی نعمت عبدالملک بن نوح سامانی کو شکست فاش دی، محمود نے اس موقع پر جو فتحنامہ دربار خلافت میں بھیجا تھا، ہلال صابی نے اپنی تاریخ میں نقل کردیا ہے، اور اس کی تاریخ کا یہ حصہ ہنوز محفوظ ہے، اس نے لکھا تھا:

بسم الله الرحمن الرحيم اما بعد	بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ مولانا امیر المومنین
فالحمد لله ...... وقد علم	اطال اللہ بقاءہ کو پرانے سامانیوں
مولانا امير المومنين اطال الله	کا حال معلوم ہے کہ وہ کس طرح کی اطاعت ظاہر
بقاءه حال الماضين من	کرتے تھے، جب ان کے صالح اسلاف کے
السامانية .... بما كانوا يظهرونه	بعد ان کے اخلاف ان کے جانشین ہوئے
من طاعة امير المومنين	تو انھوں نے اطاعت کا قلادہ اتار پھینکا
ومبايعتهم ..... ولما مضى صالحهم	اور مولانا امیر المومنین کی مخالفت کرکے

سلفهم وبقي خلف خلفهم خلعوا	جماعت میں تفریق پیدا کی اور خراسان کے
ربقة الطاعة وشقوا مخالفة	منبروں پر سے ان کا ذکر اور ان کا نام اڑادیا،
لمولانا امير المومنين اطال الله	میں نے منصور بن نوح کو ہر چند اسکی طرف
بقاءه عصا الجماعة واخلوا منابر	دوبارہ بلایا مگر اس پر سمجھانے بجھانے اور
خراسان عن ذكره واسمه	ڈرانے دھمکانے کا کوئی اثر نہیں ہوا یہاں تک
فدعوت منصور بن نوح اليها	کہ خود اس کی فوج نے اس کو پکڑ کر اندھا
ولم يصغ الى اعذار وتذكير ولم	کردیا اور اس کے بھائی عبدالملک کی بیعت
يلتفت الى انذار وتبصير	کرکے اس کو بادشاہ بنایا، میں نے اپنی عادت
الى ان اصطلم جنده فكحلوه	کے مطابق اس کے ساتھ بھی خیرخواہی کی اور
وبايعوا اخاه عبد الملك وملكوه	اس کو راہ راست پر لانے کے لیے بار بار
وجريت على عادتي مع هذا الاخير	آدمی بھیجے جب اس میں ایسی ہوئی تو
اوفد اليه مرة بعد اخرى من يدعوه	مولانا امیر المومنین کے ہوا خواہوں کو لیکر
الى الرشاد .... فلما ابيت	خود اس کی طرف بڑھا اور مرو پہنچا جس مبارک شہر
نهضت اليه بمن معي من اولياء	سے دولت عباسیہ کی دعوت کی ابتدا ہوئی
مولانا امير المومنين .... الى ان دخلت	اور امویوں کی بدعت کا خاتمہ ہوا عبدالملک
مرو ... وهو البلد الميمون الذي	مقابلہ میں آیا، دونوں فوجیں بھم گتھ گئیں،
به ابتدأ اشاعة الدولة العباسية	جنگ کے شعلے بھڑک گئے، اللہ تعالیٰ نے
وزالت البدعة الاموية	اپنے اولیاء کو فتحمند کیا، ان میں سے کسی کو
وبرز عبد الملك بن نوح	کوئی گزند نہ پہنچا اور نہ انکی تعداد میں کوئی کمی آئی

وتلاحقت الصفوف بالصفوف وتوقدت الحرب واهب الله ريح الظفر لاولیاءه ..... ثم ما انتصب منهم احد ولم ينتقض لهم عدد. وكتابي هذا وقد فتح الله تعالى لمولانا امير المومنين بلاد خراسان قاطبة .... واياه اسأل ان يهنئ مولانا امير المومنين الامام ..... القادر بالله خيرهذا الفتح الجليل خطره الواضح على وجه الزمان غرره، (كتاب التاريخ الجزء الثامن / الهلال الصابی ص ۶، ۳۴۲-۳۴۳)

یہ عروضہ مبنی ہے، اللہ تعالیٰ نے امیر المومنین کے لیے خراسان کو کامل فتح کردیا، مولانا امیر المومنین کو امام قادر باللہ کو یہ عظیم الشان فتح جس کی تابناکی سارے زمانہ میں ہے، مبارک ہو،

اس تحفے کے پہنچنے پر القادر باللہ نے محمود کے لیے خطابات اور خلعت وغیرہ بھیجے، چنانچہ گردیزی لکھتا ہے:

چون امیر محمود رحمہ اللہ از فتح کردن فارغ شد و امیر خراسان گشت و ببلخ آمد و ہنوز ببلخ بود کہ رسول القادر باللہ از بغداد بنزدیک او آمد با عہد خراسان و لوا و خلعت فاخر و تاج و ثار او را لقب نہاد یمین الدولہ و امین الملۃ ابوالقاسم محمود ولی امیر المومنین، پس چون آن عہد و لوا برسید امیر محمود بر تخت سلطنت نشست و خلعت بپوشید و تاج بر سر نہاد و بخاص و عام را بار داد اندر ذی القعدہ سنہ تسع و ثمانین و ثلث مائۃ۔"

(زین الاخبار، ص ۶۳-۶۲)

اسی طرح محمود القادر باللہ کا عقیدت کیش بن گیا، کم از کم مصلحت کی حد تک ہی، اس کے بعد سامانی خاندان ختم ہوگیا اور ہرچند اسماعیلیوں نے اس جاں بلب مریض میں جان ڈالنے کی کوشش کی، کیونکہ ان کی انقلابی سرگرمیوں کے لیے ایک کمزور اور مائل بزوال سلطنت ایک مستحکم حکومت کے مقابلہ میں زیادہ مفید تھی، لیکن یہ علاقہ ایلک خان والی کاشغر اور محمود غزنوی کے درمیان تقسیم ہوگیا، بقول گردیزی:

"مادون النہر محمود را باشد و ماوراء النہر خان را باشد۔"

لیکن اب عباسی خلیفہ القادر باللہ کے لیے ایک دوسرا مسئلہ فاطمی خلافت کی حریفانہ سرگرمیوں کی توڑ کا پیدا ہوگیا، کیونکہ اب تنہا القادر باللہ کا ذاتی مفاد معرض خطر میں نہ تھا، بلکہ خود عباسی اقتدار چند دن کا مہمان نظر آرہا تھا، اس لیے القادر کی نگاہیں پھر محمود کی طرف اٹھیں، اس نے اس کے اشارہ سے سنہ ۳۹۶ھ میں ملتان پر حملہ کرکے اس کو فتح کرلیا، اور ۴۰۳ھ میں جب عزیز باللہ فاطمی کا سفیر تاہرتی خراسان پہنچا اور اس کی جامہ تلاشی لی گئی تو اس کے پاس قابل اعتراض کاغذات برآمد ہوئے، اس لیے محمود نے اس کو حسن علوی کے ہاتھ سے قتل کرادیا، گردیزی لکھتا ہے،

و ہم اندریں سال رسول عزیز مصر آمد کہ او را تاہرتی گفتندے و چون نزدیک خراسان رسید فقہا و اہل علم گفتند کہ این رسول بدعوت عزیز مصری آید و بمذہب باطنیہ است چون محمود این خبر بشنید نیز آن رسول را پیش خویش نگذاشت و بفرمود تا او را بحسن بن طاہر بن مسلم العلوی سپردند و حسن تاہرتی را بدست خویش گردن بزد و بشہر بست۔" (زین الاخبار ص ۷۱)

اس واقعہ سے ان افواہوں کی تصدیق ہوگئی کہ خراسان میں اسماعیلی دعاۃ تخریبی سرگرمیوں میں مشغول ہیں، اس لیے محمود نے ان کی کڑی نگرانی شروع کردی، ان میں سب سے انتہائی خطرناک شیخ بوعلی سینا تھا جو دوسرے شعوبیوں کے ساتھ خوارزم کے دربار میں رہتا تھا، محمود نے اسے بلوا بھیجا مگر وہ بھاگ کر علاء الدولہ ابن کاکویہ کے دربار میں پہنچا جو بڑا سخت شعوبی تھا، اس

یہ ثابت ہو گیا کہ شیخ بو علی سینا خود اسماعیلی اور اس تحریک کا سرگرم کارکن تھا، یہ بھی مشہور ہے کہ اسی بنا پر محمود نے فردوسی کو شاہنامہ کا صلہ نہیں دیا تھا، اس کے بعد محمود قرمطیوں کے دوسرے مرکزوں کی طرف متوجہ ہوا، چنانچہ ۴۰۸ھ میں خوارزم کو ۴۱۶ھ میں سندھ کو اور ۴۲۰ھ میں رے کو جو مشرق میں خوارزم کے بعد اسماعیلیت کا دوسرا گڑھ تھا، فتح کیا، اس موقع پر جو فتحنامہ اس نے خلیفہ کو بھیجا تھا اسے ذہبی نے تاریخ الاسلام میں محفوظ رکھا ہے۔

سلام علی سیدنا و مولانا الامام
القادر باللہ امیر المومنین فان
کتاب لعبد صادر من معسکرہ
بظاہر الری غرۃ جمادی الآخرۃ
سنة عشرین وقد ازال اللہ
من هذه البقعة ایدی الظلمة
وطهرها من دعوة الباطنية
الكفرة والمبتدعة الفجرة و
قد تناهت الى الحضرة المقدسة
حقیقة الحال فی ما قصر العبد علیه
سعیه واجتهاده من غزو اهل
الكفر والضلال وقمع من نبغ
ببلاد خراسان من الفئة الباطنية
والفجار وكانت مدينة الری

سیدنا و مولانا امام القادر باللہ امیر المومنین
کو سلام پہنچے، غلام کے پاس رے کے لشکر گاہ سے غرہ
جمادی الثانی ۴۲۰ھ کو خط آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
نے اس خطہ کو ظالموں کے ہاتھ سے چھڑا دیا
اور اس کو کافر و مبتدع اور فاجر باطنیوں
کی دعوت سے پاک کر دیا، اس غلام نے
اہل کفر و ضلال سے جہاد اور خراسان میں
فرقہ باطنیہ فجار کے قلع قمع کرنے میں جو عاجز
کوششیں کی ہیں اس کی حقیقت حال حضرت
کے گوش مبارک تک پہنچ گئی ہوگی، رے کا
شہر ان کی خاص پناہ گاہ اور اس کی
دعوت کا بڑا مرکز تھا،

مخصوصة بالجائهم اليها د

اعلانهم باللہ عادوا الی کفرهم فیها (ذہبی۔ تاریخ الاسلام بحوالہ تاریخ الاسلام السیاسی از ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن جلد سوم ص ۸-۳۰۷)

یہ خط عباسی خلیفہ اور محمود کے مخلصانہ تعلقات کا ثبوت ہے، خلیفہ نے بھی اس کی عزت افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، اس کو اور اس کے جملہ اعوان و انصار کو بڑے بڑے خطابات دیے تھے، گردیزی لکھتا ہے:-

واندر شوال سنہ سبع عشر واربعمائۃ نامہ القادر باللہ آمد با عہد و لوای خراسان و ہندوستان و نیمروز و خوارزم و امیر محمود را و فرزندان و برادران او را القبہا نہادہ، اما امیر محمود را کہف الدولۃ والاسلام و امیر مسعود را شہاب الدولہ و جمال الملۃ و امیر محمد را جلال الدولہ و جمال الملۃ و امیر یوسف را عضد الدولہ و مؤید الملۃ و نامہ نوشتہ بودند و اندر نامہ گفتہ بود کہ ہر کہ را کہ تو خواہی ولی عہد خویش کن و اختیار تو اتفاق ما است و بر آن عزا با کہ امیر محمود کردہ بود قادر او را شکر بسیار کردہ بود و او را بسیار ستودہ (زین الاخبار ص ۸۷)

محمود کے بعد مسعود تخت نشین ہوا، اس کو جلد ہی سلاجقہ کی شورش کا مقابلہ کرنا پڑا، اس میں ناکام ہو کر وہ ہندوستان واپس آ رہا تھا کہ راستہ میں ماریکلہ کے مقام پر نمک حرام غلاموں نے اس کا کام تمام کر دیا، اس کے بعد شوکت محمودی ختم ہو گئی، اور غزنوی سلطنت ایک تیسرے درجہ کی ریاست بن کر رہ گئی، اس کے بعد سلاجقہ کا دور شروع ہوا، جن کا ہندوستان کی تاریخ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔

لیکن غزنوی سلطنت کے ضعف کا ہندوستان کی تاریخ پر خاصہ اثر پڑا، کیونکہ غزنوی خاندان کی اہمیت وسط ایشیا میں ختم ہونے کے بعد اس کے فرمانروا ہندوستان سے زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے،

چنانچہ ولیعہد سلطنت کو یہاں نائب السلطنت بنا کر بھیجتے تھے، اور آخر میں جب غزوں نے ان سے غزنی چھین لیا تو وہ مستقل طور سے لاہور میں منتقل ہو گئے، یہیں ۵۸۳ھ میں محمد غوری نے آخری غزنوی تاجدار خسرو ملک کو گرفتار کرکے اس خاندان کا خاتمہ کیا۔

محمود کے بعد بھی یہ خاندان تقریباً ڈیڑھ صدی تک باقی رہا، مگر ان کی سیاسی اہمیت ختم ہو گئی تھی، اور ان کا تعلق دربار خلافت (بغداد) سے بھی محض رسمی اور سلاجقہ کے توسط سے رہ گیا تھا، جو بغداد میں آل بویہ کے جانشین تھے۔

۵۸۳ھ میں غوری حکومت پنجاب میں قائم ہوئی اور اس نے بہت جلد غیر معمولی عظمت و شوکت حاصل کر لی، ادھر سلاجقہ غزوں کے ہاتھوں ختم ہو چکے تھے، اور وسط ایشیا میں خوارزم شاہی خاندان کا دور دورہ تھا، مگر یہ اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر عباسیوں کے خلاف تھے، اور ان کا زور توڑنے کے لیے علویوں کی خلافت کے متمنی تھے، دوسری طرف اس کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے قرامطیوں سے بھی جو اب ملاحدہ کہلاتے تھے، مدد لینے میں کوئی باک نہیں تھا، جو لوگ تاریخ میں حشیشین یا Assassins کہلاتے ہیں، اس وقت بڑے بڑے وجوہ و اعیان تک کے لیے ایک خطرہ بن گئے تھے۔

محمد غوری بھی محمود غزنوی کی طرح اسماعیلیوں کا دشمن تھا، وہ اور اس کا بھائی غیاث الدین خوارزم شاہیوں کے اقتدار کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے، اس لیے ان سے جنگ کرکے خوارزم شاہی فوجوں کو مسلسل شکستیں دیں، غوریوں کی قوت بڑھنے کے بعد خلافت بغداد کو محمود کی طرح ان سے بھی تعلقات پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ تاریخ میں اس قسم کے متعدد سفارتی وفود کی آمد و رفت کا حال ملتا ہے، منہاج سراج لکھتا ہے:

وچند کرت از حضرت دار الخلافت از امیر المومنین المستضئی بامر اللہ و از امیر المومنین الناصر

لدین اللہ خلعت فاخرہ بحضرت سلطان غیاث الدین طاب ثراہ واصل شد، کرت اول ابن الربیع آمد و قاضی مجد الدین قدوہ باوے بدار الخلافہ رفت و کرت دوم ابن الخطیب آمد و بندۂ ایں داعی مولانا سراج الدین منہاج طاب ثراہ باوے از غزنی بدار الخلافہ کردند۔"[1]

۵۹۹ھ میں غیاث الدین کی وفات کے بعد محمد غوری مستقل بادشاہ ہوا، مگر اب اس کی مشکلات انتہا کو پہنچ گئیں، خوارزم شاہیوں نے اس کے مقابلے کی اپنے میں تاب نہ پا کر کفار خطا سے مدد مانگی، اندخوی کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں محمد غوری کو شکست فاش ہوئی، یہاں تک افواہ پھیل گئی کہ وہ غائب ہو گیا، جس سے غوری مملکت میں بڑی ابتری پھیل گئی، ملتان میں جو ہمیشہ سے اسماعیلیوں کا گڑھ تھا، محمد غوری کے ایک سپہ سالار ایبک بالتر نے عمر بن نبران کے اغوا سے بغاوت کر دی، ادھر کھوکھروں نے پنجاب میں علم بغاوت بلند کیا، قطب الدین ایبک میں ان بغاوتوں کے فرو کرنے کی سکت نہ تھی، اس نے محمد غوری کو صورت حال سے مطلع کیا جو کفار خطا سے انتقام لینے کے لیے جا رہا تھا، اس لیے اس نے ارادہ بدل کر ہندوستان کا رخ کیا، ایبک بالتر کو شکست ہوئی اور وہ عمر بن ہزان کے ہمراہ بحال تباہ قتل کر دیا گیا۔

اس کے بعد محمد غوری کھوکھروں کی تادیب کے لیے نکلا، کھوکھر بڑی بے جگری سے لڑے مگر آخر میں انھیں بھی شکست فاش ہوئی، تقریباً دو مہینے لاہور میں قیام کرنے کے بعد خوارزم شاہ اور کفار خطا کی متحدہ فوجوں سے مقابلہ کی تیاری کے لیے غزنی روانہ ہوا، مگر راستہ میں دمیک کے مقام پر کچھ نامعلوم لوگوں نے قتل کر دیا، اغلب خیال یہ ہے کہ یہ فدائی تھے اور اس وقت افواہ تو یہاں تک تھی کہ امام فخر الدین رازی جن کا محمد غوری بے حد معتقد تھا، اس کے قتل کی سازش میں شریک تھے، اور اگلے پچھلے واقعات سے بھی اس شبہہ کو تقویت پہنچتی ہے، جس وقت اس کی لاش لے کر لوگ غزنی پہنچے تو دربار خلافت کا سفارتی وفد موجود تھا، جو غالباً خوارزم شاہیوں کے خلاف اس سے گفتگو کرنے آیا ہوگا

---

[1] طبقات ناصری ص ۷۰

محمد غوری کی وفات پر اسکی وسیع سلطنت اسکے غلاموں میں بٹ گئی، ہندوستان قطب الدین ایبک کے ہاتھ آیا، جسے محمد غوری کے بھتیجے نے خلعت اور چتر سیاہ روانہ کیا، یعنی ہندوستان کے تعلقات خلافت بغداد کے ساتھ براہ راست نہیں بلکہ محمد غوری کے بھتیجے غیاث الدین غوری کے توسط سے تھے، بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ غیاث الدین غوری کی اہمیت جلد ہی ختم ہو گئی اور قطب الدین کو بھی خلیفہ بغداد نے براہ راست عضد الخلافۃ اور نصرۃ امیر المومنین کے خطابات عطا کیے، لیکن چونکہ ہندوستانی مورخین اسکی تفصیل کے بارہ میں خاموش ہیں، اسلیے قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ قطب الدین ایبک سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی،

قطب الدین کی وفات پر پہلے آرام شاہ اور پھر اس کا منہ بولا بیٹا التمش تخت نشین ہوا، التمش کے شروع کا زمانہ تاج الدین یلدز اور پھر ناصر الدین قباچہ سے معرکہ آرائی میں گزرا، شاید دربار خلافت بھی اسکے نتیجے کا منتظر تھا، اور دیکھ رہا تھا کہ اس سیاسی کشمکش میں کون کامیاب ہوتا ہے،

۶۲۵ھ میں التمش اس خانہ جنگی میں کامیاب ہوا، اسی سال بغداد کا سفارتی وفد ہندوستان آیا، یہاں اس کا نہایت شاندار استقبال ہوا، منہاج سراج لکھتا ہے:

"دریں وقت رسل دار الخلافہ با تشریفات وافرہ بحدود ناگور رسیدہ بودند و در روز دوشنبہ بیست و دوم ماہ ربیع الاول سنہ ست و عشرین و ستمائۃ بحضرت رسیدند، و شہر را آئینہ بستند و ایں پادشاہ و ملوک و فرزندان او طاب مرقدہم و دیگر ملوک و خدام و بندگان ہمہ بخلعت دار الخلافہ مشرف گشتند۔" (طبقات ناصری ص ۱۷۴)

اسکے بعد ۶۵۶ھ میں بغداد سے خلافت عباسیہ ختم ہو گئی اور ممالک مصر نے اپنی زیر نگرانی مصر میں عباسی خلافت کا ٹھاٹھ کھڑا کیا، مگر اب تاتاریوں کا وہ دور دورہ تھا جنھوں نے مصر اور ہندوستان کی اسلامی سلطنتوں کو ایک دوسرے سے بیگانہ بنا دیا اس کے بعد سیاسی تعلقات کی تجدید ۷۴۲ھ میں بعہد محمد شاہ تغلق ہوئی، اس کی تفصیل ایک نئی کاوش کی مقتضی ہے۔

شام میں جدید عربی شاعری کا ارتقاء

از جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے بی ٹی ایچ ڈی لیگ، لکچرر شعبہ عربی بی کشیتور یونیورسٹی اندھرا

شام زمانۂ قدیم سے عربی شاعری کا گہوارہ رہا ہے، جس کی مردم خیز سرزمین نے ابو العلا المعری، بحتری اور ابو تمام جیسے عظیم شعرا کو جنم دیا، دور جدید میں بھی شام نے عربی شاعری کو آگے بڑھایا اور آب و رنگ بخشا ہے، چونکہ شام میں عیسائیوں کی تعداد بھی معتد بہ تھی اور پہلے اس میں لبنان بھی شامل تھا اس لیے یہاں عیسائی شعرا کی خاصی تعداد نظر آتی ہے، عیسائیوں نے دور عثمانی ہی میں فرانسیسی زبان کی طرف توجہ کی اور اکثر شعرا نے اس زبان میں مہارت پیدا کی جس نے ان کے ذہنی افق کو وسعت اور بلندی عطا کی،

شام میں جدید عربی شاعری کا دور در اصل ۱۸۵۰ء سے شروع ہوتا ہے، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ یورپ کا مرد بیمار نزاعی کیفیت میں تھا اور مغربی طاقتیں ایشیا پر پوری قوت سے یلغار کر رہی تھیں، فرانس اور انگلستان عربوں کو عثمانیوں کے خلاف مشتعل کر رہے تھے، خود عربوں میں بغاوت کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے، ۱۸۵۰ء سے ۱۹۱۸ء تک کے عرصہ میں مغربی تہذیب کے اثرات ہر جگہ عام ہو چکے تھے، خود عرب بھی ان سے متاثر تھے اور ان میں ذہنی بیداری شروع ہو گئی تھی، مگر حکومت کی زبان ترکی تھی اور اس کا پڑھنا لازمی تھا، اس لیے اسی کا عام رواج تھا، حد یہ کہ عربی زبان کا ذریعہ تعلیم بھی ترکی تھا، اس لیے ترکوں کی طویل حکومت کے زمانہ میں عربی ادب جمود کی حالت میں پڑا رہا۔

۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر شام نے ترکوں سے آزادی پائی اور ملک فیصل ابن حسین کی قیادت میں عربی حکومت قائم ہوئی، اس نے پہلا کام یہ کیا کہ حکومت کی سرکاری زبان عربی قرار دی۔

مصر پہلا عرب ملک تھا جس نے عثمانی اقتدار سے نجات حاصل کی، وہاں شیخ جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کی حریت پسندانہ کوششیں بھی اپنا کام کر رہی تھیں، جن کے اثرات شام و لبنان پر بھی پڑ رہے تھے، اور جمہوریت کی صدائیں عبد الرحمن کواکبی، شدیاق، ناصف الیازجی، ادیب اسحاق، حسون اور دلال کے دلوں میں جاگزیں ہو چکی تھیں، ان سب نے مل کر شام و لبنان میں بیداری پیدا کی اور قومی احساس کو جنم دیا۔

فیصل کی حکومت قائم ہونے کے بعد تمام مدارس میں عربی رائج ہو گئی، اس زمانہ میں دو اہم شخصیتیں سامنے آئیں، ایک محمد کرد علی جن کی مساعی سے دمشق میں "المجمع العلمی العربی" قائم ہوئی، انھوں نے بہت سی کتابوں کو ایڈٹ کیا، ان کے اغلاط کی تصحیح کی اور علمی طریقہ سے عربی زبان کی غیر معمولی خدمت کی، دوسری شخصیت ساطع الحصری کی ہے، جو فیصل کی حکومت میں وزیر تعلیم تھے، انھوں نے عربی زبان کی اشاعت پر غیر معمولی توجہ کی، اور طلبہ کی ذہنی تربیت کا خاص طور سے خیال رکھا۔

"المجمع العلمی العربی" کا قیام پوری عرب دنیا کے لیے رحمت ثابت ہوا، مشرق و مغرب کے عربی کے تمام ماہروں اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کا ممبر بنایا گیا، اور وضع اصطلاحات کے لیے اصول و قواعد مرتب ہوئے، بے شمار مخطوطات کو اس ادارہ نے زیور طباعت سے آراستہ کیا۔

۱۵ اپریل ۱۹۲۳ء میں (جامعہ سوریہ) سوریہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا، جس میں ابتدا میں قانون اور طب کی تعلیم کا نظم تھا،

ابتدا میں یہ دقت پیش آئی کہ ان دونوں کالجوں میں ذریعۂ تعلیم عربی تھی، اس لیے اصطلاحات کے سلسلہ میں بڑی جد و جہد کرنی پڑی، لیکن یہ عربی زبان کا معجزہ ہے کہ اس نے اپنی وسعت سے یہ مرحلہ آسانی سے طے کر لیا، اور بہت سی ضخیم کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں، اس کے بعد ادب، سائنس، تعلیم اور انجینیرنگ وغیرہ کے الگ الگ کالج قائم کیے گئے، ادب و سائنس کے کالج ۱۹۲۳ء میں قائم ہوئے اور تعلیم و انجینیرنگ کے کالجوں کا قیام ۱۹۴۶ء میں عمل میں آیا، اس لیے کہ فرانس کالجوں کے قیام سے ڈرتا تھا، وہ اپنے تہذیبی اثرات پھیلانے کے لیے طلبہ کو اپنے یہاں بھیجتا تھا، مگر اس کا اثر الٹا ظاہر ہوتا تھا، جو طلبہ وہاں سے واپس آتے وہ جذبۂ حریت سے سرشار ہوتے اور فرانس کے لیے خطرہ بن جاتے،

یہاں ایک سیاسی پس منظر کا بیان ضروری ہے، جس نے شام کی پوری زندگی کو غیر معمولی طور سے متاثر کیا، گذشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ ملک فیصل جنوری ۱۹۱۹ء میں برسر حکومت آئے، لیکن یہ حکومت بن کھلی کلی کی طرح مرجھا گئی، اس لیے کہ فرانس نے شام پر حملہ کر دیا، اور مصر و لبنان کو اپنے قبضہ میں کر لیا، شام کی قوت ہی کیا تھی، ۲۴ مئی ۱۹۱۹ء کو شامی فوج اور فرانسیسی فوج میں جنگ ہوئی اور دوسرے دن فرانس کو غلبہ حاصل ہو گیا،

ملک فیصل پہلے فلسطین گئے اور وہاں سے انگلستان چلے گئے،

اہل شام ایک دن کے لیے بھی فرانس کی حکومت سے مطمئن نہ ہو سکے اور مسلسل بغاوتیں کرتے رہے، تقریباً ۲۵ برس کی بغاوتوں نے فرانس کے چھکے چھڑا دیے اور بالآخر، ازدوری ۱۹۴۶ء میں شکری قوتلی کی قیادت میں ملک آزاد ہو گیا۔

پوری شامی قوم ربع صدی تک فرانسیسیوں کے خلاف ایک جہاد مسلسل میں مشغول تھی، بلاشبہ اس جہاد نے جسمانی قوتوں کے علاوہ فکری قوتوں کو بھی وحدت بخشی اور شعراء نے دل بھر کر اپنے اندرونی

احساسات وجذبات کا اپنی شاعری میں اظہار کیا حالانکہ وہاں آزادی فکر وخیال حاصل نہ تھی، بے شمار لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں، جلاوطنی اور قید بامشقت لوگوں نے آزادی کی راہ میں برداشت کی۔

مختلف شاعروں نے مختلف انداز سے فرانس کے ظلم وجور کی داستان بیان کی ہے، بطور نمونہ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں، شفیق جبری کہتا ہے:

لئن طوی استبداده لیلها　　　فما طوی عن مقلتی فجرها

اگر ظالم کے ظلم نے رات کو ڈھانک لیا ہے تو سحر میری نگاہ سے پوشیدہ نہیں،

مطلب یہ ہے کہ ملک میں کسی وقت جان ومال محفوظ نہیں،

ان تحرجوا الآساد فی غابها　　　هیهات ما تکفیکم شرها

اگر تم شیروں کو جنگل میں بند کر دو تو ان کے شر سے محفوظ رہنے کا خیال خام ہے،

یعنی اہل شام سے تم کو ہمیشہ خطرہ رہے گا اور وہ جہاد جاری رکھیں گے، خیر الدین زرکلی کہتا ہے:

متی تری تبسم لی؟ یا زمان　　　أ لا حنان

اے زمانہ کب تو میرے لیے مسکرائے گا۔ کیا تیرے پاس رحم ومروت نہیں،

اسلمتنی لا انس، لا امان　　　للحدثان

تو نے مجھے حوادث کے حوالہ کر دیا۔ اب نہ انسیت ہے اور نہ امن

ابکی ربوعاً لا تطیق الهوان　　　رهن امتهان

میں ان سرزمینوں کو روتا ہوں جو ذلت اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے اور ذلت کا شکار ہیں

یا زمن الشوم سقیت الشام　　　کأس الحمام

اے منحوس زمانہ! تو نے شام کو موت کا جام پلا دیا

الی متی نبقی اساری انقسام　　　والستضام

کب تک ہم قیدی بنے رہیں گے، منقسم ومظلوم ہو کر،

بدر الدین حامد نے صاف اعلان کر دیا کہ

فیا حزن ارجعی بالخزی صاغرة　　　ذکراک فی صحیفة التاریخ آثام

اے فرانس رسوائی کے ساتھ واپس لوٹ جا۔ تیرا ذکر تاریخ کے صحیفہ میں داغدار اور پُر از معصیت ہے،

ایک دوسرا شاعر فرانس کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

فکنت لئیمة حربا وسلما　　　کلؤمك فی الغرائز والطباع

تو کمینہ تھا جنگ میں بھی اور امن میں بھی۔ اسی طرح جس طرح کہ تو لئیم ہے طبیعت اور فطرت کے اعتبار سے۔

اس کے علاوہ شام کی صحافت نے بھی فکری بیداری میں بڑا حصہ لیا، اگرچہ فرانسیسی استعمار صحافتی آزادی میں حائل تھا، محمد کرد علی نے "المقتبس" کے نام سے ایک علمی رسالہ جاری کیا خلیل مردم بک نے "الرابطة الادبیة" کے نام سے ایک ادبی اور تنقیدی پرچہ نکالا، ۱۹۲۳ء میں شاکر الکرمی نے ایک ہفتہ وار پرچہ "المیزان" جاری کیا، لیکن ان کی جوان مرگی سے یہ پرچہ زیادہ دنوں ادب کی خدمت نہ کر سکا، مجلہ "الحدیث" اور "الثقافة" نے بھی شام میں آزادیٔ فکر اور بیداری کے پیام کو عام کرنے کا کام کیا، ان میں ایسے مضامین شائع ہوتے تھے جو لوگوں میں فکری بیداری پیدا کرتے تھے،

فرانسیسی ادب کے اثر سے شامی ادب میں قصہ نگاری کا رواج ہوا، ڈرامے، ناول اور افسانے کثرت سے لکھے جانے لگے، اور ان کے ترجمے عربی زبان میں ہونے لگے، اور مصر میں شامی اور لبنانی کمپنیوں نے ڈرامہ نگاری کو نئی زندگی بخشی اور اس کا رواج عام کیا۔[1]

ادب کی جدید تحریکوں کے اثرات جو یورپ کی شاعری میں عام تھے، عربی شاعری خصوصاً شامی اور لبنانی شعراء پر زیادہ پڑے ہیں، چنانچہ "شعراء مہجر" میں سب سے زیادہ تعداد ان ہی

[1] الادب العربی المعاصر فی مصر مولفہ شوقی ضیف دار المعارف مصر ۱۹۶۱ء ص ۲۱۳

علاقوں کے شعراء کی تھی، جن کی شاعری میں روحانی تحریک کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس کا دوسرا عنصر حسرت ویاس اور وطن کے لیے تڑپ اور شوق ہے،[1] چونکہ ان کی زندگیاں وطن سے دور اجنبیوں میں گذریں، اس لیے ان پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کے یہاں عجمیت زیادہ اور عربیت کمزور ہے، لیکن دور جدید کا ایک بالغ نظر ناقد محمد مندور لکھتا ہے کہ یہ الزام صحیح نہیں، ان مہجری شعراء کے اسلوب میں ضعف نہیں پایا جاتا۔[2]

اگر سنہ ۱۸۵۰ء سے ابتک کی شامی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو بنیادی طور پر اس کو تین دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ دور اول: پہلی جنگ عظیم کے قبل کا زمانہ

۲۔ دور دوم: دونوں جنگوں کے درمیان کا زمانہ

۳۔ دور سوم: دوسری جنگ کے خاتمہ سے ابتک کا زمانہ

پہلے دور میں شعراء زیادہ بیدار نہ تھے، لیکن مائل بہ بیداری ضرور تھے، اور مقفع و مسجع زبان استعمال کرتے تھے، دوسرے دور میں مغرب کے اثرات ان کے ذہنوں کو نمایاں طور پر متاثر کر چکے تھے، اور ہر چیز میں تغیر و انقلاب رونما تھا، تیسرے دور میں جدید اثرات میں پختگی اور زندگی کی حقیقت کا رنگ زیادہ نمایاں ہو گیا، ان جدید رجحانات نے شام کی شاعری میں تین عناصر پیدا کیے:

(۱) قومیت (۲) وطنیت (۳) انسانیت[3]

قومیت سے مراد عرب قومیت اور وطنیت سے مراد شامی وطنیت ہے، اسی کے ساتھ شامی شعراء کے یہاں دینی جذبات اور اسلامی تصورات بھی جدید شاعری کا اہم عنصر ہیں، بلکہ جدید مصری اور عراقی شاعری میں بھی اسلامی عنصر پوری طرح موجود ہے۔

---

[1] الاتجاہات الادبیۃ فی العالم العربی الحدیث تالیف انیس المقدسی ج ۲ ص ۹۔ [2] فی المیزان الجدید مصنفہ ڈاکٹر محمد مندور ص ۵۵۔ [3] موثرات فی الاتجاہات الفکریۃ فی بلاد الشام واثرہا فی الادب الحدیث، تالیف ڈاکٹر جمیل صلیبا ص ۸۴

عربی قومیت کے فخر کے لیے عربوں کی شاندار تاریخ اور ان کے زریں کارنامے تاریخ کے اوراق پر ثبت تھے، اس لیے ناصف یازجی کہتا ہے:

ونحن اولو المآثر من قديم | وان جحدت مآثرنا اللئام

اور ہم زمانۂ قدیم سے صاحبِ آثر ہیں خواہ کم ظرف لوگ ہمارے کارناموں کا اعتراف نہ کریں۔

عبدالرحمٰن رافعی کہتا ہے:

ولرب آثار همت تذكارها | يهب الضمائر قوة الايمان

ان کے اکثر آثار کا ذکر ضمیر کو قوت ایمان بخشتے ہیں۔

سلیمان تاجی فاروقی کہتا ہے:

بنی انهضوا واحيوا حياة عزيزة | حياة تعيد المجد للعرب ثانيا

اے اہل عرب اٹھو! اور ایسی باعزت زندگی بسر کرو جو عربوں کی عزت و مجد کو دوبارہ واپس لے آئے۔

ان قومی اور وطنی رجحانات کے علاوہ عام اخلاقی و انسانی اقدار کی ترجمانی بھی جدید شامی شاعری میں موجود ہے۔ امجد الطرابلسی کہتا ہے:

كن رحيما انما الانسان | ذو القلب الرحيم

رحم دل بنو کہ انسان وہی ہے جو رقیق القلب ہے،

جن شعرا کے کلام میں اسلامی جذبات کی ترجمانی ہے، ان میں زرکلی، خلیل مردم بک، عمر ابوریشہ اور انور عطار قابل ذکر ہیں، جنھوں نے خدا کی حمد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں بہت سے قصائد لکھے ہیں[1]

بنیادی طور پر جدید شامی شاعری میں دو مکتبِ فکر ہیں، ایک تجدد پسند شعراء کا طبقہ جس کی

---

[1] الاتجاہات الفکریۃ ص ۱۷۷۔ ۱۷۸

عربیت ناقص ہے، اور جو مغرب کی اندھی تقلید چاہتا ہے، دوسرا اعتدال پسند ہے، اور جدید و قدیم کی حسین آمیزش چاہتا ہے[1]۔

اگرچہ عربوں کی عملی سیاست میں باہم بڑا اختلاف ہے، مگر شعراء کے جذبات میں وحدت کا عنصر ہر جگہ موجود ہے، اور وحدتِ ملتِ عربیہ تمام شعراء کا بنیادی تخیل ہے، خصوصاً شامی شعراء میں خیر الدین زرکلی کی شاعری اس تخیل کی ترجمان ہے[2]۔

فرانسس مراش ۱۸۳۵ء – ۱۸۷۳ء

حلب میں ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے، بچپن میں چیچک میں مبتلا ہوئے، جس سے اگرچہ شفایاب ہو گئے مگر اس کے اثرات جسم اور نگاہ پر باقی رہے، حلب میں ایک انگریز ڈاکٹر سے جدید طب چار سال تک پڑھی، پھر حصولِ تعلیم کے لیے پیرس گئے، یہاں آنے کے بعد ان کے فکر و خیال کی دنیا بدل گئی، جس کے اثرات ان کی شاعری میں نمایاں ہیں۔

پیرس کی تنگ دستی کی زندگی اور غیر معمولی محنت نے ان کے قویٰ کو بالکل مضمحل کر دیا، بیماری و ضعف بہت بڑھ گیا، آخر میں آنکھوں کی بصارت جاتی رہی اور تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا، اس پریشانی کے عالم میں خبر ملی کہ والدین نے سفرِ آخرت اختیار کیا، اس حادثہ نے زندگی کی مسرت چھین لی اور وہ وطن لوٹ آئے، مگر طبیعت میں حوادث کے اتنے شدید اثرات تھے کہ گھر ہی میں پڑے رہتے تھے، اسی عالم میں اکثر ابوالعلاء المعری اور شوپنہار کے فلسفے سے تسکین حاصل کرتے، ۱۸۷۳ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دعوۃ الحق: اس میں فلسفیانہ خیالات ہیں۔

۲۔ مشہد الاحوال: اس میں اجتماعی زندگی کے متعلق مقامات کے طرز پر فکر انگیز خیالات ہیں۔

---

[1] الاتجاہات الفکریۃ ص ۱۳۰–۱۳۲۔ [2] دراسات ادبیۃ مصنفہ عمر الاسوقی ص ۱۰۹

۳۔ رحلۃ الی باریس: پیرس کا سفرنامہ ہے۔

۴۔ شہادۃ الطبیعۃ فی وجود اللہ والشریعۃ: علم کلام پر ہے۔

۵۔ المرآۃ الصفیہ فی المبادی الطبیعۃ: سائنس سے متعلق بحث ہے۔

۶۔ الکنوز الغنیۃ فی الرموز المیمونۃ: ۵۰۰ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ ہے جس میں میمون ابن مغتفر کے دور کے حالات ہیں۔

۷۔ مرآۃ الحسناء: دیوان ہے جو ۱۸۷۲ء میں بیروت سے طبع ہوا۔

۸۔ تعزیۃ المکروب: ایک فلسفیانہ انداز کا رسالہ ہے۔

۹۔ دلیل الحریۃ الانسانیۃ

۱۰۔ در الصدف فی غرائب الصدف: اجتماعی زندگی پر ایک ناول ہے۔

فرانسیس مراش کی شاعری میں جذبات اور یاس کی فراوانی ہے، اس نے اپنی پرمحن زندگی سے سوزِ دروں حاصل کیا اور اس کی زندگی اس کی شاعری میں جلوہ گر ہے، فرانسیسی ثقافت نے جدید اثرات کو اس کی شاعری میں اہم مقام دیدیا ہے، اس کی پرسوز شاعری کا نمونہ یہ ہے:

لعمرک واللہ فی ہذی البلاد ۔۔۔ غیر داءٍ لی و للغیر دوا

خدا کی قسم میں نے اس شہر (پیرس) میں مرض اور دوسروں کے لیے دوا کے علاوہ کچھ نہیں پایا۔

ذقت فیہا کل کاسات النکاد ۔۔۔ وکما غیری من البشر ارتوی

میں نے اس میں تلخیوں کے پیالے پیے حالانکہ دوسرے لوگ (لذتِ حیات سے) سیرو فیضیاب ہوئے،

یا فؤادی قد جری فیک الردی ۔۔۔ فعلی ہذا الردی مت او عش

اے دل تجھ پر مصیبت نازل ہو گئی ہے، تو یا تو اس ہلاکت کے باوجود زندہ رہ یا مر جائے۔

اپنے والدین کی وفات پر کہتا ہے:

فانا ابکیکما یا والدی　　　　بدموع ما بکاھا احد

اے میرے والدین میں آپکے غم میں ان آنسوؤں سے روتا ہوں جن سے کوئی نہیں روتا۔

ان فی موتکما القاسی لدی　　　　مات حقا سندی والعضدی

آپ کی المناک موت سے واقعۃً میری طاقت جاتی رہی اور میرا قوت بازو ٹوٹ گیا۔

یہ اشعار اس کے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہیں،

شاعر جب پہلی بار پیرس کے نگارخانے کو دیکھتا ہے تو اس کا دل اس کے حسن و عظمت سے معمور ہو جاتا ہے:

انی جئت باریس العلا　　　　رأت عینای ما قد سمعت

میں عظیم پیرس پہنچا اور آنکھوں کے سامنے وہ کچھ دیکھ لیا جو سنا تھا

ثمت ما لانظرت عینی ولا　　　　سمعت اذنی ولا روحی وعت

وہ دیکھا جو میری آنکھوں نے کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ کانوں نے سنا تھا اور نہ روح کی وہاں تک رسائی تھی،

آلا ماھذی المبانی والعلا　　　　ھل بروج ام نجوم طلعت

یہ بلند عمارتیں برج ہیں یا ستارے طلوع ہوگئے ہیں،

مشھد یسطو علی العقل　　　　فیہ من آی بھا الدھر ینی

ایک ایسا منظر ہے جو عقل پر چھا گیا ہو اس میں ایسی غیر معمولی چیزیں ہیں جن سے زمانہ ناواقف ہے

رزق اللہ حسون ۱۸۲۵ء - ۱۸۸۰ء

حسون کا مولد حلب ہے، خاندانی تعلق آرمینیہ سے تھا، اس لیے ارمنی زبان بھی جانتے تھے، ابتدائی تعلیم حلب میں پائی، پھر لبنان میں فرانسیسی، عربی اور ترکی زبانیں سیکھیں، ریاضی اور مذہبیات سے ان کو شغف تھا، ثانوی تعلیم کے بعد حلب واپس آئے اور کچھ

دن تک مترجم کی حیثیت سے کام کیا، پھر پیرس اور لندن کا سفر کیا، اور عرصے تک وہاں مقیم رہے، اور یورپ کی یونیورسٹیوں اور کتب خانوں سے پورا فائدہ اٹھایا، یورپ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا بہت قریب سے مطالعہ کیا، پھر مصر آئے، وہاں بہت سے مخطوطات حاصل کر کے قسطنطنیہ گئے، جہاں مشرق و مغرب کے بہت سے اہل فکر سے تعارف ہوا،

وہ استنبول میں تھے کہ اٹلی اور دولت عثمانیہ میں جنگ چھڑ گئی، اس وقت حسون نے ایک اخبار "مرآۃ الاحوال" جاری کیا، ۱۸۶۰ء میں شام کے حالات کو قابو میں رکھنے کیلیے جو لوگ بھیجے گئے اُن میں یہ بھی تھے، دمشق پہنچکر حسون نے عبدالقادر جزائری کی مدح میں قصیدہ لکھا، پھر فؤاد اول کے ساتھ ترکی واپس گئے، اور ان کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے،

کچھ دنوں کے بعد محکمۂ مالیات کے کسی عہدہ پر مامور ہوئے، اور اس سلسلہ میں ان پر ایک رقم کے غبن کا الزام لگا، اور وہ قید کر دیے گئے، کچھ دنوں کے بعد قید سے فرار ہو کر روس چلے گئے، روس سے لندن پہنچے اور دوبارہ مرآۃ الاخبار جاری کیا، جس میں عثمانیہ حکومت پر سخت تنقید ہوتی تھی، ایک رسالہ "حل المسلٔتین الشرقیۃ والغربیۃ" کے نام سے جو منظوم ہوتا تھا جاری کیا، مگر جلد ہی بند ہوگیا، دنڈسر لندن میں ۱۸۸۰ء میں غربت کی حالت میں انتقال کیا۔

ان کے دو شعر ان پر صادق آتے ہیں

قد قضی اللّٰہ ان اموت غریباً　　　　فی بلاد اساق کرھا الیھا

اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ میں غربت میں مروں ایسے دیس میں جہاں میں زبردستی کھینچ کر لایا گیا ہوں۔

وبقلبی مخدرات معانی　　　　نزلت آیۃ الحجاب علیھا

اور میرے دل میں ایسے مستور معانی ہیں جن پر آیت حجاب نازل ہوگئی ہے، یعنی ان اعلیٰ خیالات کے اظہار کا موقع نہیں۔

لندن کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے دیوان اخطل، ذوالرمۃ، نقائض جریر و فرزدق، دیوان حاتم اور صبح الاعشیٰ جیسی اہم کتابوں کو زیور طباعت سے آراستہ کیا۔

ان کے دو دواوین شائع ہو چکے ہیں: (۱) اشعر الشعر (۲) النفثات

شاعری حسون عربی، ترکی، فرانسیسی اور روسی چار زبانوں سے واقف تھے، اس لیے ان سب کے اثرات ان کی شاعری میں موجود ہیں، وطن سے دوری اور ہجوری کی بنا پر ان کی شاعری میں محبت، حزن و غم اور وطن سے اشتیاق کے جذبات موجزن ہیں،

اپنے دیوان "اشعر الشعر" میں تورات کے قصوں کو نظم کے قالب میں پیش کیا ہے جس میں حضرت ایوبؑ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ کا ذکر ہے،

حسون کو جس زمانہ میں غبن کے الزام میں قید کر دیا گیا تھا تو انھوں نے اپنی صفائی میں قصائد کہہ کر فواد پاشا کو بھیجے تھے، ایک قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں:

اعیذک اللہ ان تمیل الی — مقال واش یسعی علی دخل

میں تم کو خدا کی پناہ دلاتا ہوں کہ تم چغلخوروں کی بات سنو جو شک پیدا کرنا چاہتے ہیں،

وکیف تاخذنی باغراء ذی — حقد یکثر العداوۃ لی

اور تم میرے حاسدوں اور دشمنوں کے بھڑکانے سے کس طرح قید کرتے ہو

اشبہ خلقا بالذئب مفترساً — طار اسمہ فی الاذی مع المثل

وہ دشمن جو اپنی جبلت میں خونخوار بھیڑیا ہے اور جس کا نام اسی حیثیت سے معروف ہے

لولا البنون وما احاذرہ — ذبہا یلم بھم علی عجل

اگر بچے نہ ہوتے اور ان پر آنے والے مصائب کا خیال نہ ہوتا

ماکنت اضرع ان تحولنی — عن مقعد الذل لیس عن زللی

تو میں ہرگز اس عاجزی سے التجا نہ کرتا کہ مجھے اس ذلت سے ہٹا لیجیے جو مجھے میری غلطی کی وجہ سے نہیں پہنچی ہے۔

ادیب اسحاق ۱۸۵۶ء-۱۸۸۵ء

ادیب اسحاق ۲۱ جنوری ۱۸۵۶ء کو دمشق میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم حاصل کر کے بیروت میں ملازمت اختیار کر لی، پھر اس کو چھوڑ کر اخبار "ثمرات الفنون" اور "التقدم" میں یکے بعد دیگرے کام کرنے لگے، اس کے بعد اسکندریہ چلے گئے اور سلیم النقاش کے ڈراموں کی تمثیل میں ان کی مدد کرنے لگے، وہاں سے قاہرہ آ کر ایک ہفتہ وار رسالہ ۱۸۷۷ء میں "مصر" کے نام سے جاری کیا، اس کے بعد انھوں نے اور سلیم النقاش نے مل کر اسکندریہ سے ایک روزنامہ "التجارۃ" کے نام سے نکالا، کچھ دنوں کے بعد اخبار بند ہو گیا، اور پھر وہ پیرس چلے گئے، اور ۱۸۸۰ء میں وہاں سے ایک عربی رسالہ "مصر القاہرہ" کے نام سے جاری کیا، وہاں سینہ میں کچھ تکلیف پیدا ہو گئی، اس لیے بیروت آ گئے، اسی دوران میں مصر میں ان کا تقرر دیوان المعارف قاہرہ میں ترجمہ و انشاء کے دیوان کے "ناظر" کی حیثیت سے ہو گیا، پھر پارلیمنٹ میں کاتب ہو گئے، لیکن اعراب کی بغاوت کے بعد بیروت لوٹ آئے، اور لبنان کے ایک گاؤں "حدیث" میں وفات پائی۔

کل ۲۹ برس کی عمر پائی، مگر اس مختصر مدت میں انھوں نے بڑا کام کیا، فرانسیسی اور ترکی میں مہارت حاصل کی، مختلف ممالک کے سفر کیے، سیاسی مسائل سے دلچسپی لی، شاعروں میں امتیاز پیدا کیا اور مندرجۂ ذیل کتابیں یادگار چھوڑیں:

۱۔ نزہۃ الاحداق فی مصارع العشاق،

۲۔ تراجم مصر فی ہذا العصر

۳۔ اندروماک: فرانسیسی ناول کا ترجمہ

۴۔ شارلمان: فرانسیسی ناول کا ترجمہ

۵۔ الباریسیۃ الحسناء: فرانسیسی ناول کا ترجمہ

۶۔ الدرد : نظموں اور مقالات کا مجموعہ

ان کے کلام میں شاعرانہ خیالات کی پریشان خیالی کم اور مسائلِ حیات زیادہ ہیں، انکی زندگی میں قوت، عمل اور حرکت تھی، یہی کیفیت ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے، مغرب کے اثر سے روایتی شاعری سے ان کا دامن پاک ہے، انھوں نے زندگی کے حقائق کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، اور فکر و نظر کو نئی راہیں اس وقت دکھائی ہیں جب مشرق میں ہر طرف اندھیرا تھا اور غلامی کا کہر چھایا ہوا تھا۔

انگریزی کی ایک مثل ہے: (Might is right) قوت حق اور راستی ہے، شاید اسی تخیل سے متاثر ہوکر اور یورپ کے سیلاب قوت کو دیکھ کر انھوں نے "الحق للقوۃ" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں،

قتل امرئ فی غابۃ جریمۃ لا تغتفر　　وقتل شعب آمن مسألۃ فیہا نظر

کسی آدمی کا جنگل میں قتل کردینا ناقابل معافی ہے، لیکن ایک پرامن قوم کا قتل ایک ایسا مسئلہ ہے جو محل نظر ہے۔

والحق للقوۃ لا یعطاہ الا من ظفر

حق صرف طاقت کے لیے ہے اور حق صرف کامیاب انسان کو دیا جاتا ہے

یہ دراصل یورپ کی خونخواری پر ایک طنز ہے، عورت کے بارہ میں ان کے خیالات یہ ہیں:

حسب المرأۃ قوم آفۃ　　من یدنُ منہا من الناس ہلک

کچھ لوگوں نے عورت کو آفت تصور کیا کہ جو شخص اس کے قریب گیا وہ ہلاک ہوگیا،

ورآہا غیرہم امنیۃ　　ملک النعمۃ فیہا من ملک

کچھ لوگوں نے اس کو (حسین) آرزو سمجھا کہ جس کو یہ نعمت ملی مل گئی

وصواب القول لا یجہلہ　　حاکم فی مسلک الحق سلک

لیکن راہ حق اختیار کرنے والا صحیح بات کو نظر انداز نہیں کرسکتا

انما المرأۃ مرآۃ بہا　　کل ما تنظرہ منہا ودنک

عورت ایک آئینہ ہے جس میں تمھاری تمنائیں نظر آتی ہیں،

فہی شیطان اذا افسدتہا　　واذا اصلحتہا فہی ملک

وہ شیطان ہے اگر تم اس کو خراب کردو، اور اگر اس کی اصلاح کرلو تو وہ فرشتہ ہے

جبرائیل الدلال
۱۸۳۶ء – ۱۸۹۲ء

۳ر فروری ۱۸۳۶ء میں حلب میں پیدا ہوئے، ان کے والد عبد اللہ دلال مشہور اہل علم میں تھے، ۱۱ سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا، ان کی پھوپھی نے ان کی پرورش کی، حلب میں انھوں نے فرانسیسی اور اطالوی زبانیں سیکھیں، ترکی میں بھی درک حاصل کیا، بچپن میں عربی ادب کے اہم ادبی نمونوں کو زبانی یاد کیا تھا جس سے ان میں عربیت رچ بس گئی تھی۔

وہ پہلے استنبول گئے، وہاں سے لوٹ کر شادی کی، پھر فرانس، اٹلی اور اسپین کا سفر کیا، اس سفر میں پرتگال بھی گئے، اس عرصہ میں وہ مختلف سرکاری کام بھی کرتے رہے، اور ان کی شہرت اچھے مترجم کی حیثیت سے ہوگئی، عرب سفراء کے ترجمان کی حیثیت سے بڑی دولت پیدا کی، وزیر اعظم خیر الدین تونسی کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کیا، ایک کالج میں ملازمت بھی کی، ۱۴ برس یورپ میں گذار کر وطن آئے، مگر یہاں ان کے دشمنوں نے ان کے ایک قصیدہ "العرش والہیکل" پر اعتراضات کیے اور حکومت کی نگاہ میں ان کو باغی بنا دیا، اور وہ گرفتار کرکے قید کردیے گئے، ۱۸۹۲ء میں ۵۶ برس کی عمر میں جیل میں انتقال کیا، ان کے اعزہ نے لاش لیجاکر وطن میں دفن کی،

"العرش والہیکل" ان کی بہت اہم یادگار ہے، اس قصیدہ میں ڈیڑھ سو سے زیادہ اشعار ہیں، ان میں پہلے مطلق العنانی اور بادشاہت کو ختم کرکے جمہوری حکومت کے قیام کی ترغیب

دی گئی ہے، ظاہر ہے کہ خلیفہ عبد الحمید کی حکومت میں اس سے بڑا جرم کوئی نہ تھا، یہ قصیدہ انھوں نے پیرس کی آزاد فضا میں لکھا تھا،

اس قصیدہ کی ابتدا دینی طبقہ کی حرص دولت اور دنیا سازی سے ہوتی ہے:

کل الانام وان تباین حالها فالمال جل القصد من مطلوبها

اختلاف احوال کے باوجود کل مخلوق کا سب سے بڑا مقصود مال ہے،

فلکنیسة احبار روما ورعت للناس کفارات غفر ذنوبها

اسی کو کمانے کے لیے کنیسہ اور روم کے پادری گناہوں کے کفارے لوگوں کے لیے تقسیم کرتے ہیں

ولاجله القسان فی بیعاتها باعت ذخائرها وعود صلیبها

اور اسی کے لیے پادری عبادت گاہوں کے ذخائر اور صلیب کی لکڑیاں فروخت کرتے ہیں۔

مطلق العنان بادشاہوں کے ظلم وجور کا ذکر ہے

وکذا الملوک فلیس ینکر ما جری فینا من استبدادها وذنوبها

یہی بادشاہوں کا حال ہے، ان کے ظلم وزیادتی کے خلاف کوئی آواز نہیں بلند کر سکتا۔

پھر قوم کو ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے پر ابھارتا ہے:

هیا انهضوا وبطردها اجتهدوا فقد ساد الدمار وعم من تخریبها

اٹھو، اٹھ کھڑے ہو، بادشاہوں کو اکھاڑ پھینکو، فساد وبدبختی چھا گئی ہے اور تخریب عام ہو گئی ہے،

آخر میں جمہوری نظام کے قیام کی دعوت دیتا ہے

"ولیحکم الجمهور من عقلائه"

چاہیے کہ جمہور کا عقلمند طبقہ حکومت کرے

جمہوریت کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے:

ولتستو کل الحقوق تساد فیعود صوت تصیرها کاریبها

تمام حقوق میں اتنی مساوات ہونی چاہیے کہ چھوٹے آدمی کی آواز بھی بڑے اور عقلمند آدمی کی طرح سنی جا سکے کہ بڑے آدمی اور چھوٹے کی تفریق باقی نہ رہے۔

حتی تری کل الوری فوق الثری بالامن یرعی شاتها مع ذیبها

یہانتک کہ روے زمین کی ساری مخلوق امن کی زندگی بسر کر سکے اور بھیڑیا بکری ایک ساتھ رہ سکیں

عبد المسیح الانطاکی ۱۸۷۵ء۔ ۱۹۲۲ء

عبد المسیح کا خاندانی تعلق یونان سے تھا، مگر ان کے آبا و اجداد انطاکیہ چلے آئے تھے، پھر حلب میں آباد ہو گئے، عبد المسیح حلب میں ۱۲۶۳ھ میں پیدا ہوئے، اور وہیں تعلیم حاصل کی، پھر تقریباً کل عرب ملکوں کا دورہ کیا، اور وہاں کے امیروں کی شان میں قصیدے لکھے، خصوصاً خزعل خاں شیخ المحمرہ کی شان میں کئی قصیدے پیش کیے، اور بڑا انعام واکرام حاصل کیا، خلیفہ عبد الحمید کے ظلم سے پوری عرب دنیا نالاں اور دستوری جمہوری حکومت کی خواہاں تھی، اس لیے عبد المسیح نے جمہوری حکومت کے قیام کو اپنا مقصد قرار دیا اور اسکی اشاعت وتبلیغ کے لیے "الشذور" کے نام سے ایک رسالہ نکالا، پھر دوسرا رسالہ مصر سے "الشہباء" اس کے بعد "العمران" نکالا۔

ان کی حسب ذیل تصانیف ہیں:-

(۱) نیل الامانی فی دستور العثمانی (۲) النهضة الشرقیه (۳) القصیدة العلویة المبارکة،

عبد المسیح کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا قصیدۂ علویہ ہے، جس کو وہ "ملحمہ" کہتے ہیں، یہ قصیدہ اہل مغرب کے طرز پر نظم کیا گیا ہے، ملحمہ کے لغوی معنی واقعہ عظیمہ کے ہیں، اس قصیدہ میں عربوں کی عظمت، انکی جغرافیائی پوزیشن، اسلامی تاریخ اور اس کے مفاخر پر روشنی ڈالی گئی ہے، شاعر اگرچہ عیسائی ہے مگر متعصب نہیں، وہ خود ایک جگہ لکھتا ہے کہ بچپن میں ہمارے خاندانوں میں عیسائی اور مسلمانوں میں نفرت تھی، عیسائی مسلمانوں کی مذمت کرتے تھے مگر جب میں ان سے ملا تو انکے حسن معاملہ اور اخلاق کی وجہ سے

میری رائے اس معزز قوم کے بارہ میں دوسرے عیسائیوں کی رائے سے مختلف ہوگئی ہے،

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

اذا رجعنا الی تاریخ ماضیها والعرب من اقدم الوری حسباً

عرب تمام مخلوق میں عزت و وقار کے لحاظ سے قدیم تر ہیں، اگر ہم ان کی تاریخ پر نظر ڈالیں

اخلاقها وسمت سمواً مبادیها مع خشونتها فی عیشها لطف

باوجود کھردرے پن کے انکی زندگی میں لطف ہے اور ان کے اخلاق بلند ہیں،

وانما الشعر تاریخ الاعاریب قد — ابقی لها ابد اذکری معالیها

شاعری عربوں کی تاریخ ہے جس نے ان کی عظمتوں کو جاوداں بنا دیا ہے۔

وکل سام عظیم من ماٰتیها فیه عرفنا مغازیها وهمتها

اسی سے ہم ان کی جنگوں اور ان کی بہادری سے آگاہ ہوئے اور انکے کارنامے عظیم ہیں،

بها الفخار فلیس العد یحصیها اما شمائلها الغرالتی بلغت

ان کے بلند اخلاق قابل فخر اور حد شمار سے باہر ہیں،

ان عاهدت حفظت رغم الزمان عهو — دالاصدقاء وبالارواح تفدیها

اگر وہ عہد کرتے ہیں تو زمانہ کے خلاف دوستی کے عہد کو پورا کرتے ہیں، اور اس کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں،

حتی ولوکان من اعدی اعادیها وضیفها لم یهب غدر الزمان به

اور ان کا مہمان اپنے ساتھ زمانہ کی غداری کا تصور نہیں کرسکتا، خواہ وہ بدترین دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

لہ الادب العربی المعاصر فی سوریۃ دار المعارف مصر مصنفہ سامی الکیالی ص ۸۱

لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

ہندستان کے علمی و تحقیقی مفاخر میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین دہلی اور مجلس علمی ڈابھیل عالمی مقام رکھتے ہیں، انکے علاوہ بعض دوسرے خالص علمی و تحقیقی ادارے بھی ہیں جنکی خدمت ان اداروں سے کم نہیں ہے، ان ہی میں لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد بھی ہے، مگر افسوس کہ ہندستان کے اہل علم اس ادارہ سے بہت کم واقف ہیں اور ارباب علم و تحقیق کے حلقہ کے علاوہ اس کا عام تعارف نہیں ہے، اسکی بڑی وجہ اس ادارہ کے مخلص ارباب نظم و نسق کی بے نیازی اور عام اہل علم کی بے پروائی ہے،

۱۳۴۰ھ میں حضرت مولانا ابوالوفا صاحب افغانی مدظلہ کی سرپرستی میں دس مخلصوں نے ملکر اپنے طور پر ائمۂ احناف کی امہات کتب شائع کرنے کیلئے لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ کے نام سے اس ادارہ کو قائم کیا اور متاخرین علمائے احناف کی جنایت کا کفارہ ادا کیا تھا، انھوں نے امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد اور دوسرے قدیم ائمۂ احناف رحمہم اللہ کی تصنیفات کے مقابلہ میں علمائے متاخرین خصوصاً علمائے ماوراء النہر کی کتابوں کو زیادہ اہمیت دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ائمۂ احناف کی امہات کتب کا رواج ہی نہیں بلکہ ان کا وجود بھی ختم ہونے لگا تھا، چنانچہ بہت سی قدیم اہم کتابیں عالم اسلام سے نیست و نابود ہوگئیں، جو باقی رہ گئیں ان کے نادر و نایاب نسخے ایشیا اور یورپ کے کتب خانوں کی زینت بنے رہے، حالانکہ ان کے مقابلہ میں بہت کم درجہ کی کتابیں ہمارے علماء کی توجہ کا مرکز بنی رہیں، وہ داخل نصاب کی گئیں، ان کے شرح و حواشی لکھے گئے، اور ان کو وہ اہمیت دیگئی جس کی وہ کسی حال میں مستحق نہیں تھیں، اس صورت حال نے مولانا ابوالوفا صاحب افغانی اور ان کے چند رفقاء کو آمادہ کیا کہ وہ صرف اخلاص اور علمی و دینی خدمت کے لیے خدا کے بھروسے پر یہ کام شروع کریں، چنانچہ انھوں نے اتنی خاموشی اور بے نیازی سے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا کہ ہندستان

کے اہل علم اسکی پوری قدر نہ کرسکے، اور نہ ائمہ فقہ و حدیث کی جو نادر و نایاب اور اہم کتابیں شائع ہوئیں، ان سے دلچسپی لے سکے، کیونکہ عام مذاق کے مطابق احیاء المعارف النعمانیہ کے کارکنوں نے اخبارات و رسائل اور دوسرے ذرائع سے پروپیگنڈا نہیں کیا، بلکہ کام میں لگے رہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس خالص علمی ادارہ سے ہم اسقدر بے خبر اور بے نیاز رہیں کہ اس کی مطبوعہ کتابوں تک سے نابلد ہوں، ہندوستان کے علماء اور خاص طور سے علمائے احناف کی یہ ناقدرشناسی بڑی افسوسناک ہے،

البتہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے بعض خطوط میں جو مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کے نام ہیں، احیاء المعارف النعمانیہ کا تذکرہ نہایت فاضلانہ انداز میں قدردانی اور ہمت افزائی کے طور پر کیا ہے (یہ خط معارف کے کسی گذشتہ اشاعت میں چھپ چکا ہے) خود اسکے بانی و صدر مولانا ابوالوفا صاحب افغانی نے راقم کے نام متعدد خطوط میں تحریر فرمایا ہے کہ "سید صاحب ہمارے کام کی بڑی قدر کرتے تھے، اور جہاں کوئی نئی کتاب یہاں سے شائع ہوتی اور انکی خدمت میں روانہ کیجاتی تو فوراً نہایت انشراح و انبساط کے ساتھ معارف میں اس کا ذکر فرماتے، اور ہماری ہمت افزائی فرماتے۔"

پچھلے دنوں راقم نے اس ادارہ کی دو ایک کتابوں کا تفصیلی تعارف معارف میں کرایا ہے، جی چاہتا ہے کہ سید صاحب کے معارف ہی میں اس ادارہ کی تمام مطبوعات کا سرسری تعارف کرایا جائے تاکہ اہل علم کو اس ادارہ کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہوسکے اور وہ ملک کے دوسرے علمی و تحقیقی اداروں کی طرح اس مخلص اور خاموش ادارہ کیطرف بھی اپنی توجہ منعطف کریں۔

۱۳۴۹ھ میں اس ادارہ نے پہلی کتاب، کتاب العالم والمتعلم شائع کی، اس کے آخر میں عربی اور اردو میں مجلس احیاء المعارف النعمانیہ کا تعارف بعنوان بشارت یوں درج ہے:

"عامہ اہل اسلام کو عموماً اور علمائے احناف کو خصوصاً خوشخبری دیجاتی ہے کہ حضرت امام الائمہ سراج الامہ امام اعظم رضی اللہ عنہ اور آپ کے اصحاب اور اصحاب اصحاب کی تصانیف مہمہ جو ابتک طبع نہیں ہوئیں، اور بالکل نایاب ہیں، ان کی طباعت و اشاعت کی غرض سے مجلس احیاء المعارف النعمانیہ قائم کی گئی ہے جو چند باخبر علماء اور باغیرت اصحاب کی ہمتوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے، الحمد للہ کہ سب سے پہلے جس کتاب کی اشاعت کی سعادت مجلس ہذا کے حصہ میں آئی

وہ حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ کی تصنیف منیف کتاب العالم والمتعلم ہے، اسکے بعد انشاء اللہ کتاب النفقات للخصاف کی شرح للصدر الشہید شائع ہوگی، نیز کتاب ادب القاضی للخصاف کی شرح للصدر الشہید، جامع کبیر للامام محمدؒ اور مبسوط للامام محمدؒ بروایت ابی سلیمان جوزجانی کی طباعت بھی پیش نظر ہے، امید کہ اہل علم اور ارباب کرم مجلس ہذا کی اعانت فرمائیں گے، کتاب العالم والمتعلم مقامات مندرجہ ذیل سے طلب کی جاسکتی ہے، (الف) دفتر مجلس احیاء المعارف النعمانیہ (شفاخانہ محمودیہ) جلال کوچہ حیدرآباد (ب) جناب مولوی ابوالوفا صاحب رکن مجلس احیاء المعارف النعمانیہ مدرسہ نظامیہ حیدرآباد (ج) محمد اکبر علی معتمد مجلس احیاء المعارف النعمانیہ بازار گھانسی حیدرآباد۔"

یہ اشتہار محمد اکبر علی صاحب معتمد مجلس کی طرف سے ۱۳۴۹ھ میں شائع ہوا ہے اور مجلس کی فہرست میں ۱۳۳۰ھ درج ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۳۳۰ھ میں یہ مجلس مولانا ابوالوفا صاحب افغانی مدرس مدرسہ نظامیہ اور محمد اکبر علی صاحب معتمد مجلس وغیرہ دس ارکان کی کوشش سے قائم کی گئی جس کا بنیادی مقصد ائمہ احناف کی امہات کتب کی اشاعت تھا اور مندرجہ اشتہار کتابیں اسکے ابتدائی اشاعتی نظام میں رکھی گئی تھیں، ۱۳۴۹ھ سے ۱۳۸۵ھ تک (۳۶ سال کی مدت میں) اس مجلس نے مندرجہ ذیل کتابیں شائع کیں، ہم سلسلہ وار ہر کتاب کا سرسری تعارف مختصر الفاظ میں کراتے ہیں، تفصیلی تعارف مقصود نہیں،

۱- کتاب العالم والمتعلم:- امام ابوحنیفہؒ کی تالیف ہے، کشف الظنون میں اس کا تعارف اس طرح درج ہے:
یہ کتاب متعلم کے سوال اور عالم کے جواب کے طریقہ پر لکھی گئی ہے جو عقائد و نصائح پر مشتمل ہے، اس کتاب کو ابومقاتل نے امام صاحب سے روایت کیا ہے، مجلس کے علم میں اس کا ایک قلمی نسخہ رام پور کے شاہی کتب خانہ میں تھا، جو اغلاط سے پر تھا، مگر اس وقت اس کے دوسرے نسخہ کا پتہ نہیں تھا، اسی لیے اسکو اصل قرار دیکر حاشیہ میں جگہ جگہ عبارت کی تصحیح کی گئی، بعد میں اس کا ایک اور نسخہ ملا، مگر کتاب چھپ چکی تھی، اس لیے دوسری اشاعت میں اس سے استفادہ کا وعدہ کیا گیا، غالباً اس کے مصحح و محشی مولانا ابوالوفا صاحب افغانی تھے، یہ کتاب مطبع چشتی حیدرآباد میں ربیع الاول ۱۳۴۹ھ میں چھپی،

کل صفحات ۱۳۰ تھے، تعداد طبع ایک ہزار تھی، کتابت، طباعت اور کاغذ معمولی تھا، جو مجلس کی بے سروسامانی اور مالی دشواری کا نتیجہ تھا،

۲۔ شرح کتاب النفقات:- امام ابوبکر احمد بن عمرو بن مہیر الخصاف الشیبانیؒ متوفی ۲۶۱ھ کی کتاب النفقات کی شرح ہے، اور امام ابو محمد حسام الدین عمر بن عبدالعزیز بخاریؒ متوفی ۵۳۶ھ المشہور بالصدر الشہید کی تصنیف ہے، اس کتاب کے دو قلمی نسخے کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ میں تھے، وہاں سے ایک کی نقل دوسرے سے مقابلہ کے بعد منگائی گئی، مگر یہ نسخہ اغلاط سے پر تھا، اسلیے مولانا ابوالوفا افغانی، مولوی سید عبداللہ بن احمد مدیحج علوی حضرمی اور مولوی رحیم اللہ ارکان مجلس نے اسکی تصحیح کی، چونکہ شرح النفقات کی اکثر عبارتیں محیط برہانی سے منقول ہیں اسلیے تصحیح میں اس کتاب سے بڑی مدد ملی، یہ کتاب ذیقعدہ ۱۳۴۹ھ میں مطبع دکن لا رپورٹ حیدرآباد میں چھپی، کل صفحات ۵۶ ہیں، اس میں کتابت، طباعت اور کاغذ معمولی ہے، اس پر حاشیہ مولانا افغانی نے لکھا ہے،

۳۔ کتاب الآثار، للامام القاضی ابی یوسف:- یہ کتاب درحقیقت مسند الامام الاعظم ہے، جسے امام ابو یوسف نے امام صاحب سے روایت اور بعض مقامات پر اپنی مرویات و آثار کا اضافہ کیا ہے، اس کو مسند ابی یوسف بھی کہتے ہیں، اسکی روایت امام ابو یوسفؒ کے صاحبزادے ابو محمد یوسف بن یعقوبؒ نے کی ہے، ہندوستان، ترکی، شام اور مصر کے کتب خانوں میں تلاش بسیار کے باوجود اس کتاب کا کوئی نسخہ نہ مل سکا، صرف دارالکتب المصریہ میں ایک سقیم و ناقص نسخہ ملا، اس میں سقوط اور تقدیم و تاخیر بھی تھی، درمیان کے بعض اوراق غائب تھے، کتاب النکاح، کتاب الایمان، کتاب الحدود، اور کتاب الشہادۃ ناقص تھے، تقدیم و تاخیر کی وجہ سے کتاب الطہارت میں کتاب الصلوٰۃ کے آثار، کتاب النکاح میں کتاب الطلاق کے آثار اور مختلف ابواب و کتب میں ادھر کے آثار ادھر تھے، مولانا ابوالوفا افغانی نے بڑی دقت نظر اور محنت شاقہ سے حتی الامکان ان اسقام کی تصحیح کی، اسکی روایات و آثار کے دوسری کتب حدیث سے حوالے لکھے، رواۃ کے ذکر، حل لغات اور فقہی تفریعات میں کوشش کی، کہنا چاہیے کہ اس کتاب کی اشاعت سے مجلس کا کام اعلیٰ پیمانہ پر جاری ہوا، ۱۳۵۵ھ میں مصر کے مطبع الاستقامہ میں نہایت اہتمام سے چھپی، کاغذ نہایت

عمدہ اور عربی ٹائپ بہترین ہے، قاہرہ میں مجلس کے وکیل رضوان محمد رضوان نے اپنی نگرانی میں چھپوایا، کتاب الآثار کے بارے میں ابتدا میں چھ صفحات کا مقدمہ ہے، فٹ نوٹ میں باریک ٹائپ میں حواشی ہیں اور آثار پر ترتیب وار نمبر درج ہے، اصل کتاب کے صفحات ۲۴۲ ہیں، اس کے بعد ۲۶ صفحات میں فہرس الابواب، فہرس موضوعات اور فہرس اسماء رواۃ ہیں، کل کتاب ۲۶۸ صفحات میں ہے،

۴۔ الجامع الکبیر، للامام محمد بن حسن الشیبانی:- جامع کبیر امام محمد کی وہی معرکۃ الآراء کتاب ہے جس کے بارے میں امام محمد بن شجاع ثلجی نے فرمایا ہے کہ اسلام میں فقہ کے موضوع پر امام محمد کی جامع کبیر جیسی دوسری کتاب نہیں لکھی گئی، امام محمد کی مثال جامع کبیر میں ایسی ہے کہ کسی آدمی نے ایک محل بنایا، جوں جوں وہ اونچا ہوتا گیا، سیڑھیاں بڑھتی گئیں، یہاں تک کہ جب محل مکمل ہو گیا تو تمام سیڑھیاں گرادیں اور لوگوں سے کہا کہ اب تم اس کے بام و در پر چڑھو، اس عظیم کتاب کی اشاعت کے لیے مجلس نے استنبول اور مصر کے کتب خانوں کو کھنگالا، استنبول میں ایک کامل نسخہ اور دارالکتب المصریہ میں ایک ناقص نسخہ مل سکا، پھر ہندوستان میں اسکی تلاش کیلئے ٹونک، دہلی، پشاور اور جبال افاغنہ کے کتب خانوں کی خاک چھانی، ٹونک کے کتب خانہ صاحبزادہ عبدالرحیم میں ایک کامل و مکمل نسخہ ملا، مولانا افغانی نے کتب خانہ میں بیٹھکر اسے نقل کیا، ترکی کے مخطوطہ کی نقل منگوائی اور مصر سے ناقص نسخہ کا فوٹو حاصل کیا، شیخ محمد راغب الطباخ نے حلب سے شرح الجامع الکبیر للعتابی کی نقل روانہ کی، اس طرح جامع کبیر محنت شاقہ کے بعد قابل اشاعت ہوئی اور ۱۳۵۶ھ میں مطبعۃ الاستقامہ مصر سے نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین ٹائپ میں چھپکر شائع ہوئی، طباعت و تصحیح کے نگران و ذمہ دار مجلس کے مصری وکیل شیخ رضوان محمد رضوان تھے، اس کے کل صفحات ۳۷۶ ہیں،

۵۔ کتاب الرد علی سیر الاوزاعی:- یہ امام قاضی ابو یوسف کی تصنیف ہے، امام اوزاعی نے جب امام محمدؒ کی کتاب السیر الصغیر دیکھی تو فرمایا کہ اہل عراق کو سیر و مغازی کے فن سے کیا تعلق ہے، صحابہ تو حجاز و شام میں تھے، عراق نیا شہر ہے، امام اوزاعی نے بھی کتاب السیر لکھی تھی، ان کی اس تنقید کے بعد امام محمد نے اپنی

کتاب السیر الکبیر لکھی جس میں امام اوزاعی کی کتاب السیر کے بعض بعض مقامات کا ضمناً رد لکھا، اور امام ابو یوسف نے مستقل رد لکھا چونکہ امام محمد اور امام ابو یوسف نے سیر المغازی کا فن براہ راست امام ابو حنیفہ سے حاصل کیا تھا، اسلیے انھوں نے امام اوزاعی کی تنقید کو امام صاحب پر طعن قرار دیا، اور دونوں حضرات نے اس کا جواب لکھا، اس کتاب کا صرف ایک نسخہ ہندوستان میں مل سکا، اسی کو تصحیح و تعلیق کے بعد شائع کیا گیا، یہ خدمت مولانا افغانی نے انجام دی، ۱۳۵۷ھ میں مصر میں مجلس کے وکیل رضوان محمد رضوان کی زیر نگرانی شاندار کاغذ، روشن ٹائپ میں چھپی ہے، اور فٹ نوٹ میں مولانا افغانی کے علمی و تحقیقی حواشی ہیں، کل صفحات ۱۳۵ ہیں، اس کے بعد سات صفحات میں فہرست مضامین ہے۔

۶۔ اختلاف ابی حنیفۃ و ابن ابی لیلی، للقاضی الامام ابی یوسف :۔ ابتدا میں امام ابو یوسف امام ابن ابی لیلی سے تعلیم حاصل کرتے تھے، پھر امام ابو حنیفہ کے یہاں پہنچے، اور بعد میں اپنے دونوں اساتذہ کے درمیان مختلف فیہ فقہی مسائل کو اس کتاب میں جمع کیا، چونکہ امام ابو یوسف نے اس کتاب میں احادیث و آثار مرفوعہ و موقوفہ اور مسندہ، منقطعہ بلاغات کو بکثرت جمع کیا ہے، اسلیے اس کی بڑی اہمیت ہے، اس کا صرف ایک قلمی نسخہ ہندوستان میں مل سکا، اسی کو تعلیق و تصحیح کے بعد شائع کیا گیا، ۱۳۵۵ھ میں مطبعۃ الوفا مصر میں نہایت اچھے انداز میں زیر اشراف رضوان محمد رضوان وکیل مجلس چھپی، ابتدا میں ۸ صفحات کا مقدمہ ہے، فہرست کے علاوہ کل صفحات ۲۲۳ ہیں،

۷۔ مناقب الامام ابی حنیفہ و صاحبیہ ابی یوسف و محمد بن الحسن :۔ یہ امام ذہبی کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے امام ابو حنیفہ اور صاحبین کے حالات و مناقب درج کیے ہیں، امام ابو حنیفہ کے مناقب والا حصہ مولانا مفتی محمد سعید شافعی حیدر آبادی کے کتبخانہ سے ملا اور صاحبین کے حالات و مناقب کا حصہ مصر میں علامہ زاہد کوثری کے پاس تھا، مناقب الامام ابی حنیفہ والا حصہ اغلاط سے پر تھا اسلیے اسے بھی علامہ زاہد کوثری کے پاس بھیجا گیا، انھوں نے ہر حصے کی تعلیق و تصحیح کرکے مجلس کو بھیجدیا، پھر مولانا افغانی نے اس پر حاشیہ لکھا، اس طرح دونوں محققوں کی تعلیق کیساتھ یہ کتاب ۱۳۶۶ھ میں دار الکتاب العربی مصر کے مطبع میں چھپی، امام ابو حنیفہ کا تذکرہ صفحہ ۳۰ تک ہے، اسکے بعد امام ابو یوسف کا حال ۳۰ سے ۴۸ تک اور امام محمد بن حسن کا تذکرہ ۵۰ سے ۶۰ تک ہے، کتاب کے کل صفحات ۶۰ ہیں، رضوان محمد رضوان وکیل مجلس مشرف ہیں، اس کا کاغذ معمولی ہے۔

۸۔ مختصر الطحاوی :۔ یہ مشہور حنفی امام ابو جعفر طحاوی متوفی ۳۲۱ھ کا فقہ پر مختصر مگر نہایت جامع متن ہے، کشف الظنون میں ہے کہ مختصر الطحاوی فی فروع الحنفیہ کو امام طحاوی نے کبیر و صغیر دو کتابوں میں لکھا ہے، اور اس کو امام مزنی شافعی کی کتاب مختصر المزنی کی ترتیب پر مرتب کیا ہے، جامع ازہر مصر کے کتبخانہ میں اس کے دو قلمی نسخے تھے، تیسرا نسخہ آستانہ میں شیخ الاسلام علامہ فیض اللہ کے کتب خانہ میں تھا، مصری نسخہ کو نقل کرکے اسی کو اصل قرار دیا گیا، اور ترکی والے نسخہ کا فوٹو منگا کر مقابلہ کیا گیا، تصحیح و مقابلہ اور تعلیق مولانا افغانی نے کی، یہ کتاب ۱۳۷۰ھ میں مطبعہ دار الکتاب العربی مصر میں عمدہ طباعت کے ساتھ چھپی ہے، کل صفحات ۴۸۰ ہیں، اگر مختصر القدوری کی جگہ ہمارے مدارس میں اسے رواج دیا جائے تو بہت فائدہ ہو، اس میں بہت سے مسائل و فروع نادر ہیں اور طرز بیان اور ترتیب بھی بہت اچھی ہے،

۹۔ اصول السرخسی دو حصے :۔ یہ امام ابو بکر محمد بن احمد بن ابی سہل سرخسی متوفی ۴۹۰ھ کی اصول فقہ پر اہم ترین کتاب ہے، ابتدا میں پتہ چلا کر حلب کے مدرسہ عثمانیہ اور کتب خانہ احمدیہ میں اسکے دو نسخے موجود ہیں، علامہ محمد راغب الطباخ نے نقل اور مقابلہ کرکے ایک نسخہ روانہ فرمایا، پھر تیسرا نسخہ حیدر آباد میں مولانا محمد سعید صاحب کے کتب خانہ میں ملا، کتاب کی طباعت کے آخری ایام میں دوسرے متعدد نسخوں کا بھی پتہ چلا، اصول السرخسی اصول فقہ پر نہایت جامع و ضخیم کتاب ہے، مولانا افغانی کی مختصر تعلیق و تصحیح کے بعد مطبعۃ دار الکتاب العربی مصر میں ۱۳۷۲ھ میں رضوان محمد رضوان کی زیر نگرانی دو حصوں میں چھپی، حصہ اول کے صفحات ۳۶۶ اور حصہ دوم کے ۳۸۷ ہیں، حسامی اور نور الانوار کی جگہ اس کتاب کا رواج بہت مفید ہو سکتا ہے،

۱۰۔ النکت للسرخسی شرح لزیادات الزیادات للامام محمدؒ :۔

۱۱۔ و شرح الزیادات للعتابی :۔

امام محمد نے جامع کبیر کی تصنیف کے بعد چند ایسے فروع کو جن کا ذکر اس میں نہیں تھا، زیادات کے نام سے یکجا کیا، اس کے بعد اسی قسم کے کچھ مزید فروع کو زیادات الزیادات کے نام سے مدون کیا، النکت

زیادات الزیادات کی شرح ہے جسے امام سرخسی نے لکھا ہے، اور دوسری شرح زیادات کی ہے جو امام زین الدین ابونصر احمد بن محمد بخاری عتابیؒ متوفی ۵۸۶ھ کی تصنیف ہے، شرح سرخسی کے قلمی نسخے ترکی کے کتب خانہ شیخ الاسلام فیض اللہ، کتب خانہ سلطان محمد فاتح اور کتب خانہ شیخ الاسلام ولی الدین میں تھے، ان کے فوٹو منگائے گئے، اور تینوں سے مقابلہ کے بعد نسخہ مکمل کیا گیا، شرح عتابی کا نسخہ ترکی کے کتبخانہ چوربیلی اور کتب خانہ شہید علی پاشا میں تھا، اس کا عکس منگایا گیا، اور دونوں شرحوں کو ایک ساتھ اس طرح چھاپا گیا کہ ایک صفحہ پر پہلے شرح سرخسی اور اس کے حواشی کو رکھا گیا، پھر شرح عتابی اور اس کے حواشی درج کیے گئے، اس مجموعہ کی طباعت ۱۳۷۰ھ میں حیدرآباد میں نہایت عمدہ عربی ٹائپ میں ہوئی، کیونکہ مشکلات کی وجہ سے مصر میں مجلس کی کتابوں کی طباعت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، کل صفحات ۱۴۰۸ ہیں، اس کے بعد ۲۵ صفحات میں مختلف فہرستیں اور چار صفحات میں صحت نامہ ہے،

۱۲- کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ:- یہ امام محمدؒ کی بڑی معرکہ کی کتاب ہے، اس پر راقم کا تفصیلی تبصرہ معارف میں چھپ چکا ہے، امام محمد نے اس کتاب میں امام مالکؒ اور دوسرے علمائے مدینہ منورہ کے اور امام ابوحنیفہ اور علمائے عراق کے فقہی اختلافات میں اہل مدینہ کے مقابلہ میں اہل عراق کا اقرب الی الاحادیث والآثار ہونا ثابت کیا ہے، اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ حنفی فقہ اہل الرائے نہیں بلکہ فقہ اہل الحدیث ہے، کتب خانہ مدینہ منورہ میں اس کا ایک نسخہ ملا جو ناقص و سقیم تھا، اس میں تقدیم و تاخیر بھی تھی، اور تحریفات و بیاضات بھی تھے، پھر ترکی کے کتب خانہ نور عثمانیہ میں ایک نسخہ کا پتہ چلا، مگر وہ مدینہ منورہ والے نسخہ کی نقل تھا، اور خود حیدرآباد میں مولانا انوار اللہ صاحب کے کتب خانہ میں ایک نسخہ تھا جو زیادہ صحیح تھا، اسی کو اصل قرار دیکر اصل نسخہ مرتب کیا گیا، اس کتاب کی تصحیح و تعلیق مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری نے کی ہے، حاشیہ کیا ہے، بہترین مکمل شرح ہے، ۱۳۸۵ھ میں اس کا پہلا حصہ حیدرآباد میں عربی ٹائپ میں چھپا ہے، کل صفحات ۵۰۰ ہیں، تین چار جلدوں میں یہ کتاب مکمل ہوگی،

مجلس احیاء المعارف کی مطبوعات میں یہ آخری کتاب ہے، ۲۰ سال کی قلیل مدت میں اس مجلس نے احناف کی اہم کتب کے ۲۴ سو سے زائد صفحات دنیائے اسلام کے سامنے پیش کیے ہیں، صرف آخری کتاب میں حکومت ہند کی وزارت معارف نے کچھ امداد دی ہے، مولانا افغانی اس مجلس کے جزو کل ہیں، سادات و مشائخ افاغنہ کے اس بزرگ کا عہد پیری مجلس کے لیے عہد شباب کی باتیں کرتا ہے، ضرورت ہے کہ اہل علم مجلس کے ان دینی و علمی اور فقہی نوادر کی قدر کریں، اور اسکی مطبوعات و منشورات سے فائدہ اٹھائیں، سرمایہ کی کمی اور ہماری ناقدری کی وجہ سے اسکے بہت بڑے بڑے کام رکے ہوئے ہیں،

آخر میں اپنوں کی ناقدری اور غیروں کی قدردانی کے دو عبرت انگیز واقعات سنیے، مولانا افغانی نے انکو خود راقم سے بیان کیا ہے، ۱۳۷۰ھ میں مختصر الطحاوی چھپی جسکی قیمت دس روپے تھی، مگر دو سال کے بعد پندرہ روپے ہوگئی، ایک مرتبہ مولانا بمبئی تشریف لائے تو راقم نے معمول کے خلاف اسکی قیمت بڑھ جانے کی وجہ دریافت کی، مولانا نے فرمایا، بات یہ ہوئی کہ ہمارے مصری وکیل شیخ رضوان محمد رضوان نے مختصر الطحاوی کے کچھ نسخے نمونہ کے طور پر امریکہ کی یونیورسٹیوں اور کتب فروشوں کے یہاں بھیجے، چند دنوں کے بعد وہاں سے اسکی مانگ بہت زیادہ بڑھ گئی کیونکہ اب یورپ اور امریکہ کے تعلیم یافتہ اور مشرقیات سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم کا عام رجحان یہ ہوگیا ہے کہ اسلام کو اسکے اصلی خدوخال میں سمجھنے کیلیے قدیم ائمہ اسلام کی کتابوں کو دیکھنا چاہتے ہیں، جن کا ذہن و مزاج خالص اسلامی تھا اور جو اسلامی علوم و فنون کو سیدھے سادے انداز میں الفاظ و عبارات اور فرق و ملل کے خارجی اثر و رجحان کے بغیر لکھتے تھے، اسلام کی سچی تصویر ان ہی کی کتابوں میں مل سکتی ہے، اسلیے اب وہاں قدیم سے قدیم تر اسلامی ماخذوں کی تلاش ہو رہی ہے، چنانچہ اسلامی فقہ اور تشریعی قوانین کی تحقیق کے سلسلے میں مختصر الطحاوی بھی انکی خصوصی توجہ کا مرکز بن رہی ہے،

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ لجنۃ احیاء المعارف کی ایک کتاب مولانا نے بڑی عقیدت سے قدردانی کی امید پر حیدرآباد کے ایک بہت بڑے عالم کو پیش کی، اور اپنے قلم سے سرنامہ پر عقیدتمندانہ عبارت لکھی، چند دنوں کے بعد بمبئی کے ایک تاجر کتب حیدرآباد پرانی کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں گئے، اور ایک دکان سے پرانی کتابوں کا ایک ڈھیر خرید کر لائے، اتفاق سے وہ مولانا ہی کے یہاں ٹھہرے تھے، جب انھوں نے ان کتابوں کی چھان بین کی تو ان میں وہ کتاب بھی تھی جس کے اوراق بھی ابھی کاٹے نہیں گئے، انھوں نے فوراً یہ کتاب لیجا کر مولانا کے سامنے پیش کر دی، اور مولانا سر پکڑ کر بیٹھ گئے،

مطبوعات جدیدہ

کتاب المعتمد فی اصول الفقہ (لابی الحسین البصری المعتزلی) مرتبہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس، شائع کردہ المعہد العلمی الفرنسی دمشق، ضخامت ۱۰۸۰ صفحات، قیمت؟

معتزلیوں کی کتابیں ناپید سی ہیں، ان کے عقائد پر کچھ چیزیں چھپی ہیں لیکن اصول فقہ پر انکی یہی پہلی کتاب ہے جو شائع ہوئی ہے، یہ اچھے کاغذ، اچھی طباعت اور اشاریہ وغیرہ کے ساتھ دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، شروع میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے چالیس پچاس صفحوں میں ایک ضخیم دیباچہ فرانسیسی زبان میں لکھا ہے، اس میں نہ صرف ابو الحسین کی سوانح عمری اور کتاب کے مختلف مخطوطات کا ذکر ہے، بلکہ دو اہم امور پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی ہے، پہلے تاریخ عالم میں اصول فقہ کی اہمیت بتائی گئی ہے، دنیا کے ہر ملک اور ہر زمانے میں قوانین و احکام پائے جاتے رہے ہیں، چین، ہند، بابل، مصر، یونان، روما، جنوبی امریکہ ہر جگہ ایسے مجموعے قدیم زمانہ سے ملتے رہے ہیں لیکن ایک مجرد علم قانون جس میں احکام و قواعد سے بحث نہ ہو بلکہ نفس قانون کی اہمیت پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی گئی ہو، یہ اسلام سے پہلے کسی قوم میں نہیں ملتا، اسی کو اصول فقہ کہتے ہیں، جس کا اطلاق کسی بھی ملک کے قانون پر کر سکتے ہیں، کیونکہ اس میں بحث اس سے ہوتی ہے کہ قانون کا فلسفہ کیا ہے؟ اس کے ماخذ کیا ہیں؟ اس کی تعبیر، تبدیلی، استنباط، تنسیخ وغیرہ کے کیا طریقے ہیں؟ وغیرہ اس کی موجودہ قدیم ترین کتاب امام شافعی کا "الرسالہ" ہے، اگرچہ اس سے پہلے امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی کی بھی ایسی تالیفوں کا ذکر سوانح نگاروں نے صراحت سے کیا ہے، یہ دلچسپ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ان مسلمان مؤلفوں نے قانون کو ایک درخت قرار دیکر اس کے دو حصے کیے ہیں: فروع (شاخیں) جس میں احکام کی تفصیل ہوتی ہے، اور اصول (جڑیں) جس میں علم قانون و قانونیات سے بحث ہوتی ہے۔

دوسرے معتزلہ کے عقائد کے متعلق ان کے مخالفین کی تالیفوں میں جو چیزیں بیان ہوئی ہیں اُن میں سے بعض چیزوں کی تردید اس مستند معتزلی تالیف کے ذریعہ سے ہو جاتی ہے، مثلاً یہ مشہور بات ہے کہ معتزلہ حدیث کو نہیں مانتے، اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف متاخرین بلکہ متقدم و متشدد معتزلی (نظام وغیرہ) بھی حدیث کے واجب العمل ہونے کو مانتے ہیں، صرف خبر واحد کے متعلق نظام نے ایک لطیف بحث کی ہے، وہ یہ کہ قاضی کو فیصلے کے لیے دو گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے، گواہ صرف ایک دستیاب ہو تو وہ اسے جھٹلاتا نہیں مگر ثبوت کے لیے اسے کافی نہیں سمجھتا، اسی طرح احکامی حدیث کے بھی دو راوی ہونے ضروری ہیں لیکن ابو الحسین اسے رد کرتا اور خبر واحد کو بھی واجب العمل قرار دیتا ہے،

تذکرۂ زنداں: - جناب خورشید احمد صاحب، ایم اے، ال ال بی، متوسط تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۰۸، قیمت قسم اول عہ، معمولی للعہ، پتہ مکتبہ چراغ راہ، ڈوٹیا بلڈنگ، آرام باغ روڈ کراچی

پروفیسر خورشید احمد صاحب اڈیٹر چراغ راہ جماعت اسلامی پاکستان کے مشہور رکن اور اہل قلم ہیں، جنوری ۱۹۶۴ء میں جب حکومت نے جماعت اسلامی کو خلاف قانون قرار دیا تو یہ بھی گرفتار ہو گئے تھے اور نو مہینے قید و بند میں رہے، زیر تبصرہ کتاب اسی اسیری کی روداد ہے، حکومت کی زیادتی اور جماعت کی بے گناہی کا فیصلہ تو عدالت کر سکتی ہے، لیکن مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جماعت کو اس کے جمہوری اور اسلامی نظام کے مطالبہ پر تختۂ مشق بنایا گیا، اسی مناسبت سے انھوں نے اسلامی تاریخ کے بعض نامور ائمہ و اکابر کے قید و بند کے واقعات تحریر کیے ہیں، جو نہایت اثر انگیز اور پُر درد ہیں اور بعض مسائل، مثلاً سیفٹی ایکٹ اور نظام جیل وغیرہ کی خرابیوں پر مناسب انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے، یہ کتاب آپ بیتی ہونے کے باوجود دلچسپ ہے، لائق مرتب کے شگفتہ انداز تحریر نے اس میں مزید حلاوت اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔

امیر خسرو: - افضل العلماء مولانا محمد یوسف کوکن عمری صدر شعبہ عربی فارسی مدراس یونیورسٹی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۷۶، قیمت تحریر نہیں، پتہ مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن مدراس ۱۴

۲۱ر دسمبر ۱۹۶۲ء کو جمعیۃ المعارف مدراس کی ساٹھ سالہ تقریب کے موقع پر مولانا محمد یوسف صاحب نے عربی میں امیر خسرو

ایک محققانہ مقالہ پڑھا تھا، جواب رسالہ کی صورت میں شائع ہوا ہے، اس میں امیر خسرو کے حالات و سوانح، امرا و سلاطین سے ان کے تعلقات اور انکی تصنیفات نظم و نثر پر تبصرہ کیا گیا ہے، قران السعدین میں سلطان ناصر الدین اور اس کے فرزند معز الدین کیقباد کی جنگ اور پھر صلح اور مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کے دس خصوصیات بیان کیے گئے ہیں، مرتب نے ان سب کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جو خصوصیت سے پڑھنے کے لائق ہیں، رسالہ مختصر ہونے کے باوجود پُر مغز اور جامع ہے۔

کُرل:۔ مترجمہ جناب حسرت سہروردی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۵۲ مجلد قیمت للعہ پتہ: ساہتیہ اکاڈیمی، نئی دہلی۔

مذکورۂ بالا کتاب سنہ عیسوی سے بھی کچھ پہلے کے ایک حکیم ورد انا تمرو ولور کا صحیفۂ اخلاق و موعظت ہے جو تامل زبان میں تھا، اسکی ابتدا حمد باری سے اور خاتمہ عشق و محبت اور ہجر و وصل پر ہوتا ہے، یہ آخری حصہ عام کتاب کے مقابلہ میں زیادہ شوخ اور رنگین ہے، درمیان میں بیاسوں عنوانات کے تحت فضائل و رذائل اخلاق کا ذکر ہے، مصنف کو جین مذہب کا پیرو بتایا جاتا ہے جین مذہب ہندو مت سے متاثر ہے، اسلیے اس کتاب کے مندرجات میں ہندو مت کی بھی بعض باتیں آگئی ہیں لیکن وہ اخلاقی نوعیت کی ہیں، اور تقریباً سبھی مذاہب میں مشترک ہیں، اس لیے ان کا مطالعہ سب کے لیے مفید اور سبق آموز ہوگا، ترجمہ سلیس اور شگفتہ ہے۔

مقالات شریعت و حکمت: مولانا حکیم محمد زماں صاحب قاسمی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۰۰، مجلد قیمت عہ پیسہ، پتہ: مولوی محمد عرفان قاسمی دواخانہ ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱۔

یہ مختصر مگر مفید طبی، مذہبی اور معاشرتی مضامین کا مجموعہ ہے جو سب طبعزاد ہیں، صرف ایک مضمون شاہ ولی اللہ صاحب کی تفہیمات سے ماخوذ ہے، ایک مضمون سیرت نبویؐ سے متعلق بھی ہے، یہ سب مضامین اخبار کے لیے لکھے گئے تھے اس لیے عام فہم اور آسان زبان میں ہیں، اور اوسط درجہ کے پڑھے لکھے مسلمانوں کے پڑھنے کے لائق ہیں۔

جلد ۹۹ ماہ شوال المکرم ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۶۷ء عدد ۲

مضامین

عنوان	مصنف	صفحات
شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۸۲-۸۴
مقالات		
الفوز العظیم (سفرنامۂ حج)	نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم	۸۵-۱۰۴
تہذیب کی تشکیل جدید	جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۰۵-۱۱۸
شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز	جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی	۱۱۹-۱۳۵
شام میں جدید عربی شاعری کا ارتقاء	جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے بی ٹی، ایچ (علیگ)، لکچرر شعبۂ عربی ونکٹیشور یونیورسٹی آندھرا	۱۳۶-۱۴۹
سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کا شعری اور ادبی ذوق	جناب محمد شکیل احمد صاحب ایم اے شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی	۱۵۰-۱۵۶
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۱۵۷-۱۶۰